اردو آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جون 2018

www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10 ₹

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

اُردو دُنیا

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے ،اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی

فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066 فون: 26109746 فیکس: 26108159
E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

اردو آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 2 شمارہ: 6 جون 2018

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: 64 Total Pages

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

نگارشات ارسال کرنے کے لیے ای میل: kduniya@ncpul.in

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

مشیر: شعیب رضا فاطمی

فہرست

اداریہ

مکالمہ — مدیر

روبرو

معروف گلوکارہ چھایا گانگولی سے .... صدر عالم گوہر — 5

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار — 10

جہانِ نسواں

عصمت چغتائی کا ناول 'معصومہ' ...... غوث النساء — 11

ہندوستانی تصور تانیثیت — شاذیہ تمکین — 15

صغریٰ عالم کی شاعری .... قمر النساء — 21

اقبال اور قرۃ العین حیدر کے فکری ..... نورینہ پروین — 25

ہندوستان کی پہلی معلمہ .... فیاض عالم — 28

قانون میں خواتین

نئے آرڈیننس میں عورتوں دلچسپیں .... خواجہ عبدالمنتقم — 31

کہانیاں

میراث — پروفیسر شاہدہ شاہین — 34

روح ایک پرندہ ہے — زیب النساء حیا — 37

لمحے اور خواہشات — ڈاکٹر پرتیبھا رائے / رقیہ جمال — 39

ٹوٹ گیا اک تارا — تسنیم سلیم چھتاری — 43

حسنِ سخن

رونق دہلوی 51، تحسین کاظمی 52، سیدہ نفیس بانو شمع 52، پروین شیر 53

درخشاں اندرابی 53، عذرا نقوی 54، کہکشاں تبسم 54

باورچی خانہ

لذیذ پکوان — 55

صحت

صحت اور تندرستی — 57

آرائش و زیبائش

حسن کی نگہداشت — 59

تاثرات: گھر گھر سے — 61

قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

مقامِ اشاعت و صدر دفتر: فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159، ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 22-7-110، قمر دفتر، ساجد یار جنگ کمپلکس، بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002، فون: 24415194 - 040

مکالمہ

خواتین دنیا کا سفر جاری ہے ہر ماہ اس کے مداحوں میں اضافہ ہو رہا ہے تعداد اشاعت میں بھی خاطر خواہ اضافہ کی نوید ہے۔ یہ سب آپ لوگوں کی محبتوں کا نتیجہ ہے۔ قومی اردو کونسل نے روز اول سے اپنے جو اہداف مقرر کیے تھے اسے حاصل کیا ہے۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ پچھلے دنوں عالمی اردو کانفرنس کے موقع پر جس اردو ای بک کا اجرا ہوا ہے اس نے دھوم مچا رکھی ہے۔ آپ کو یہ جان کر مزید خوشی ہوگی کہ نوری نستعلیق کا یہ پہلا ای بک ہے جسے قومی اردو کونسل نے ڈیولپ کیا ہے اور اس کے ذریعہ ساری دنیا کے اردو دیوانے کونسل کے تمام کتب و رسائل کو اپنے ہاتھ میں دستیاب گزٹ پر بے حد آسانی سے ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھ سکتے ہیں۔ اردو والوں نے ہر دور میں اپنے عہد کے بڑے بڑے چیلنجز کو قبول کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان کی اہلیت کسی سے کم نہیں۔ ماہنامہ خواتین دنیا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس وقت جب ساری دنیا میں یہ شور مچایا جا رہا ہو کہ اب رسائل و جرائد ہوں یا کتابیں صرف آن لائن ہی باقی رہ جائیں گی۔ قومی اردو کونسل نے ماہنامہ خواتین دنیا کا اجراء کیا اور محض ایک برس اور چند ماہ میں اس کی مقبولیت آسمان کو چھونے لگی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور خوش خبری یہ ہے کہ اب ماہنامہ خواتین دنیا کو ISSN نمبر بھی حاصل ہو گیا ہے اور اب اس رسالے میں ریسرچ اسکالرس کی شمولیت ناگزیر ہو گئی ہے۔ دراصل جب اس رسالے کا ڈول ڈالا گیا تھا اسی وقت سے میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ پورے ملک میں آدھی آبادی کی ترجمانی کرنے والا ایک بھی سرکاری اردو جریدہ نہیں ہے۔ جس دن یہ رسالہ منظر عام پر آئے گا اس رسالے کو قارئین کی کمی نہیں رہے گی۔ میرا یہ خیال سچ ثابت ہوا۔ ہمیں ابھی بہت آگے جانا ہے کیونکہ دنیا کی سب سے حسین مخلوق کی ترجمانی کرنے والے رسالے کی آب و تاب کو مزید خیرگی عطا کرنے کے لیے جس محنت، خلوص اور جانفشانی کی ضرورت ہے وہ بوجوہ ہو نہیں پا رہا ہے۔ کسی بھی رسالے کے مشمولات کو ہم خود سے خلق نہیں کرتے بلکہ جو ہمیں حاصل ہوتا ہے اسی سے انتخاب کرتے ہیں۔ جہاں تک مشمولات کی دستیابی کا سوال ہے اس کے لیے ہم گزارش ہی کر سکتے ہیں جو کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ رسالہ مرکزی حکومت کی نوڈل ایجنسی NCPUL کے ذریعہ شائع کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے ہمارے لیے ملک اور حکومت موجودہ کے پروگرام اور ان کی پالیسیوں (جو خواتین سے متعلق ہیں) کو مشتہر کرنا بھی ضروری ہے اور ہم گاہے بگاہے یہ کرتے بھی رہتے ہیں۔ ہمارے وزیر اعظم نے گذشتہ 4 برسوں میں یہ ثابت بھی کیا ہے کہ وہ خواتین کی بہتری اور ان کی ترقی کے راستے کے کانٹے ہٹانے میں کس قدر سنجیدہ ہیں ایسے میں ہمارا فرض ہوتا ہے کہ ہم اپنے اپنے حصے کا چراغ بھی روشن کریں اور جہاں بھی ہم رہتے ہیں وہاں اپنے آس پاس کے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کریں، اپنے بچوں کے اسکول سے لے کر ہسپتال تک گلیوں سے لے کر بازار تک پر گہری نظر رکھیں اور نہ خود گندگی یا گندے پانی کو جمع کریں اور نہ ہی کسی اور کے ذریعہ کیے جانے پر نظر انداز کریں خواتین کے مسائل اور ان کے سدباب کے لیے سرکار کے اٹھائے گئے اقدام سے خود بھی واقف ہوں اور اپنے آس پاس کے لوگوں کو بھی واقفیت بہم پہنچائیں۔ ہم سب اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ حکومت لاکھ پالیسیاں بنا لے، پروگرام مرتب کر لے، عوامی بیداری کے بغیر اسے عمل میں لانا ناممکن ہے اور عوامی بیداری کے سلسلے میں سب سے اہم رول ہماری خواتین ہی ادا کر سکتی ہیں۔

عوامی بیداری اور ہماری ذمہ داریوں کے حوالے سے آپ بہت کچھ لکھ بھی سکتی ہیں اور ان مضامین کو خواتین دنیا میں شائع کرنے کے لیے بھی بھیج سکتی ہیں۔

'خواتین دنیا' آدھی آبادی کا ترجمان ہے اور باقی آدھی آبادی اس کے بغیر ادھوری اس لیے ہے کہ جلال بغیر جمال لاحاصل ہے اور صرف جلال سے یہ دنیا چل ہی نہیں سکتی تھی۔ اسی لیے اس مالک کائنات نے پہلے آدم کو مٹی سے خلق کیا اسے تمام علوم سے مزین کیا اور جب وہ مکمل ہو گیا پھر اس کی پسلی سے حوا کو پیدا کیا۔ حوا مٹی سے بھی بنائی جا سکتی تھیں انھیں علوم دنیاوی سے مزین کیا جا سکتا تھا لیکن خدا کی حکمت ہی کچھ اور تھی اس نے ایک مکمل باکمال اور علوم کائنات سے مزین انسان کے پہلو سے حوا کو پیدا کر کے اس کی عظمت و پاکیزگی پر مہر لگا دی۔ یہ رسالہ خدا کی اسی سب سے حسین مخلوق کا ترجمان ہے اور اسے آگے اور بہت آگے جانا ہے۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضی کریم)

صدر عالم گوہر

معروف گلوکارہ چھایا گانگولی سے صدر عالم گوہر کی ایک ملاقات

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چشم نم مسکراتی رہی رات بھر
رات بھر درد کی شمع جلتی رہی
غم کی لو تھرتھراتی رہی رات بھر

مخدوم محی الدین کی یہ غزل جب بھی ریڈیو پر سنتا ہوں ۔قدم اچانک رک جاتے ہیں ۔ایک تو اتنی نازک غزل اور بہترین موسیقار جے دیو، کی دل میں اتر جانے والی دھن، ''رات بھر'' ردیف کی تکرار کے ساتھ ساتھ ایک بہت ہی پرسوز آواز کا جادو بھلا کون اس کے سحر سے بچ پائے گا۔اور اس پرسوز آواز کی مالک ہیں ۔گلوکارہ چھایا گانگولی ویسے تو چھایا گانگولی نے اور بھی نظمیں غزلیں گائیں مگر مخدوم کی اس غزل نے انہیں وہ مقبولیت دی کہ انہیں پیچھے دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی ۔اس غزل سے انہیں بہترین گلوکارہ کا نیشنل ایوارڈ پانے کا فخر حاصل ہوا۔

اردو زبان کا جادو ایسا ہے کہ سر چڑھ کر بولتا ہے جہاں اردو زبان کی اس غزل نے انہیں بہترین گلوکارہ کا ایوارڈ دلایا وہیں اردو زبان کی اور بھی پیاری پیاری چیزیں لے کر وہ دنیا کے سامنے حاضر ہوئیں جیسے نظیرا کبر آبادی کا ہولی گیت ''جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں'' اور یہ رنگ ایسا جھمکا کہ دنیا واہ واہ کر اٹھی ۔یہ ہی نہیں حضرت امیر خسرو کا وہ مشہور کلام ''زحال مسکیں مکن تغافل'' کو اس انداز سے پیش کیا کہ ایک نیا لطف پیدا ہو گیا۔

چھایا گانگولی کا انٹرویو لینے کا میرا دو مقصد تھا۔پہلا مقصد ایک خاتون جو فلموں اور موسیقی سے جڑی ہوں ان کو قریب سے جاننے کا موقع مل جائے ۔دوسرا یہ کہ میں جے دیو صاحب کا انٹرویو لے چکا تھا ۔جو میں نے ایک ٹیپ ریکارڈ سے ریکارڈ کیا تھا۔اب تو لوگ ٹیپ ریکارڈ اور کیسٹ کو بھول گئے ہیں ۔کیسٹ کسی طرح سے میرے پاس محفوظ ہے ۔جب میں نے جے دیو صاحب کا انٹرویو لیا تھا تو وہ چرچ گیٹ اسٹیشن کے پاس ہی للی کورٹ نامی بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور میں رہتے تھے ۔اچھی خاصی پوزیشن میں تھے مجھے اب بھی یاد ہے وہ منظر جب میں ان سے انٹرویو لینے گیا تھا۔سفید کرتے چوڑی دار پاجامے میں ملبوس تھے ۔بڑے پرسکون اور خوش اخلاق پھر میں چند برسوں کے لئے ممبئی سے دور ہو گیا تھا۔اس کے بعد جے دیو صاحب کا انتقال ہو گیا ۔اور ان کے انتقال کے بارے میں اور اس وقت کے ان کے حالات کے بارے میں جو کہیں کسی اخبار میں پڑھا تو دل تڑپ اٹھا۔آخری دنوں میں بڑی خستہ حالت میں تھے ۔للی کورٹ چھوڑ دیا تھا۔انتقال بڑی دردناک حالت میں ہوئی وغیرہ وغیرہ ۔میں بہت دکھی ہوا۔اور سوچنے لگا کہ جے دیو صاحب پر لکھے گئے مضمون میں کتنی صداقت ہے اس کی تہہ تک جانے کے لئے ان کے جو بہت قریب تھے ان میں سے کسی ایک شخص سے ملا جائے ۔جے دیو صاحب نے بہت سے نئے گلوکار گلوکاراؤں کو بریک دیا تھا۔نئے چہروں کو متعارف کرانے کا ایک بڑا کام کیا تھا۔ان کے متعارف کرائے ہوئے چہروں نے خوب شہرت پائی ۔جن میں گلوکار سریش واڈیکر، ہری ہرن، پیناز مسانی اور چھایا گانگولی اہم ہیں ۔چونکہ میں آکاشوانی ممبئی سے بھی منسلک ہوں اور اپنے مقالے اور شاعری کی ریکارڈنگ کے لئے بلایا جاتا ہوں اور چھایا گانگولی کا بھی بڑا گہرا رشتہ آکاشوانی ممبئی اور وودھ بھارتی سے رہا ہے ۔بلکہ وہ ریٹائر بھی وہیں سے ہوئی ہیں ۔اس لئے چھایا گانگولی سے ملنا مجھے سب سے آسان لگا۔

وہیں ان کی ایک سہیلی مل گئیں۔ میں نے ان سے ان کا ٹیلیفون نمبر لیا۔ اور فون لگایا۔ چھایا گانگولی بہت ریزرو رہتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ریٹائر ہونے کے بعد اور زیادہ مصروف ہوگئی ہیں بہت سے موسیقی کے اداروں سے ان کا تعلق ہے۔ جس کی وجہ سے ممبئی سے اکثر باہر رہتی ہیں۔ مہاراشٹر اور دلی وغیرہ کے موسیقی کے اداروں میں اپنی اہم خدمات انجام دیتی ہیں اس لئے جب بھی فون کیا تو وہ ممبئی سے باہر ملیں۔ مگر جب جے دیو صاحب کا نام لیا اور ان سے متعلق فون پر بھی کچھ گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا میں ممبئی پہنچ رہی ہوں دو تین دن کے بعد پھر آپ آیئے تفصیل سے گفتگو ہوگی۔

میں نے تین دن کے بعد فون کیا تو وہ مل گئیں ممبئی میں اور کہا کہ دس گیارہ بجے آجایئے۔ میں تقریباً بارہ بجے پہنچا ان کے یہاں اور گفتگو کا سلسلہ جو شروع ہوا تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ کچھ ان کی باتیں کچھ موسیقار جے دیو صاحب کی باتیں کچھ ہم دونوں کی مشترکہ یادیں ان معنوں میں کہ فلمی شخصیات میں سے جن لوگوں سے میرے تعلقات ہیں ان کے بھی تعلقات ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کا ذکر بھی دوران گفتگو آیا۔ جن میں خاص طور سے خیام صاحب، ندا فاضلی صاحب وغیرہ کی باتیں اور بات "نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی۔" کے مصداق باتیں دور تک گئیں۔ اسی دوران کھانے کا وقت بھی آگیا۔ میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود انہوں نے میری اچھی ضیافت کی۔ شاید انہیں معلوم تھا کہ میں آرہا ہوں، اس لئے میرے طعام کا بھی انتظام تھا۔ دوران طعام گفتگو چلتی رہی۔ پیش ہیں اس انٹرویو کے چند اقتباس۔

س: آپ نے اردو کب اور کہاں پڑھی؟

ج: اردو زبان مجھے شروع سے اچھی لگتی ہے۔ خاص کر اردو زبان میں جو نزاکت ہے۔ جو لفظوں کا تلفظ ہے۔ اس سے جو ایک نفاست جھلکتی ہے اس سے میں بہت متاثر رہی۔ اس لئے جب میں سینٹ زیویرس کالج میں ایم ایس سی بوٹنی میں پڑھ رہی تھی تو اس وقت میں نے اردو کلاس جوائن کی تھی۔ اردو کلاس جوائن کرنے کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ مجھے غزل گانے میں دلچسپی تھی اور میں تلفظ صحیح کرنا چاہتی تھی۔ پڑھائی ختم کرنے کے بعد مجھے کالج میں ہی نوکری مل گئی مگر میں نے اس نوکری کو خیر باد کہا کیونکہ میں نے سوچا کہ جب میں کالج میں لیکچرر رہوں گی تو مجھے لیکچر بھی دینا پڑے گا اور لیکچر دینے سے گلا خراب ہوگا۔ اور میں گلوکارہ نہیں بن سکوں گی۔ ساتھ ہی میں یہ بھی چاہتی تھی کہ میں خود کفیل ہو جاؤں اور پھر آزادی سے گلوکاری کو اپنا سکوں۔ اردو سیکھنے کے بعد میرا حوصلہ بلند ہوا۔ مجھ میں خود اعتمادی آئی اور انہیں دنوں میں نے روزگار سماچار کے ذریعے ریڈیو کے لئے درخواست دی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ریڈیو کے لئے میرا انتخاب ہو گیا اور میں ریڈیو میں اپنی خدمت انجام دینے لگی۔

س: فلم "گمن" میں گانے کا موقع آپ کو کیسے ملا؟

ج: میں نیشنل سینٹر آف پرفارمنگ آرٹس (NCPA) میں پنڈت رام نارائن جی سے سیکھ رہی تھی، وہ مشہور موسیقار جے دیو کے دوست تھے۔ اس وقت دوردرشن پر ایک پروگرام چل رہا تھا "آروہی"۔ جنم اشٹمی اسپیشل کے لئے اسی پروگرام میں جے دیو جی نے مجھے بلایا۔ حالانکہ میرا گانا انہوں نے کبھی نہیں سنا تھا لیکن جانتے تھے کہ میں سیکھ رہی ہوں۔ اس پروگرام کی نظامت پنڈت نریندر شرما کر رہے تھے۔ جے دیو جی نے مجھ سے پوچھا، "تم کس کے پاس سیکھتی ہو" میں نے کہا "ہیرا دیوی مشرا سے ٹھمری سیکھ رہی ہوں۔ انہوں نے س، پ، س، سنانے کو کہا اور پھر اگلے دن ٹھمری انگ کے دو بھجن سکھائے۔ "آروہی کے اس پروگرام کو بہت پسند کیا گیا"۔ جسے 31 دسمبر کو بھی دوردرشن نے دوبارہ ٹیلی کاسٹ کیا جس میں سال بھر میں پیش کئے گئے پروگراموں میں سے بہترین پروگرام کے حصوں کو پیش کیا جاتا تھا۔ میرے پروگرام کو کافی سراہا گیا۔ اس کے چھ مہینے کے بعد جے دیو جی نے مجھے بلایا اور کہا تم کو فلم گمن کے لئے ایک گیت گانا ہے۔ میں بہت نروس ہوگئی۔ میں نے کہا ابھی میری رینج زیادہ نہیں ہے۔ تو پھر انہوں نے کہا: "ہم تمہاری رینج میں ہی گوائیں گے۔" پھر انہوں نے تفصیل سے باتیں کی۔ کہا: "نئے ہدایت کار ہیں مظفر علی، جو فلم بنا رہے ہیں، اس میں سبھی نئے گلوکاروں کو موقع دیا جا رہا ہے۔ فلم "گمن" میں میری گرو ہیرا دیوی مشر سے بھی گوایا، ہری ہرن اور سریش واڈیکر نے بھی گائے۔ یہ سارے فلموں کے لئے نئے گلوکار تھے۔ اس کے لئے ہم نے خوب ریہرسل کی تھی۔ جے دیو جی بڑے پیار سے پیش آتے تھے۔ تب میں ریکارڈنگ کے بارے میں کچھ جانتی نہیں تھی۔ لیکن انہوں نے ایک بچے کو جیسے سکھا پڑھا کر تیار کرتے ہیں بالکل اسی طرح مجھے تیار کیا تھا۔ پہلے ہی سے لوگ کہہ رہے تھے کہ جے دیو صاحب کی کمپوزیشن ہی اتنی اچھی ہے کہ یہ گانا ضرور ہٹ ہوگا۔ جے دیو صاحب کی خوب دعائیں ملی۔

س: آپ غزل بہت اچھا گاتی ہیں آپ کو غزل گانے کا شوق کیسے پیدا ہوا؟

ج: میں نے جب بیگم اختر کو سنا تو مجھے ان کا غزل گانا بہت اچھا لگا۔ میں بہت متاثر ہوئی بیگم اختر سے اور میں سوچنے لگی کہ کاش میں بھی ایسا گاتی اور یہیں سے مجھے غزل گانے کا شوق پیدا ہوا۔

س: مخدوم محی الدین کی غزل "آپ کی یاد آتی رہی رات بھر" کے

لئے جب بہترین گلوکارہ کا نیشنل ایوارڈ ملا تو آپ کو کیسا لگا؟

ج: مجھے تو ایسی امید نہیں تھی کہ مجھے ایوارڈ ملے گا۔ ہاں لوگوں کو میرا گانا پسند آجائے یہی میرے لئے بہت ہوگا۔ ایسا میں سوچ رہی تھی۔ مگر خدا نے میری محنت، لگن اور کوشش کو منظور کر لیا۔ لوگوں نے میری اس غزل کو کافی سراہا اور خدا نے مجھے نیشنل ایوارڈ دلایا۔ میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ کیونکہ آدمی جہاں تک نہیں سوچتا ہے اس سے آگے تک پہنچ جائے۔ اس سے زیادہ مل جائے۔ تو خوشی کی بات ہوتی ہی ہے۔

س: آپ نے مدھورانی سے بھی گانے کا گر سیکھا۔ ان سے آپ نے گائیکی کی کون کون سی باریکیاں سیکھیں؟

ج: میں مدھورانی جی سے جے دیو صاحب کے گھر پر ہی ملی تھی۔ وہ بہت پیار سے مجھ سے پیش آئیں۔ انہوں نے مجھے اپنی چھوٹی بہن کی طرح سکھایا۔ ان کے پاس بڑے بڑے استاد آتے تھے۔ مدھورانی جی نے مجھے یہ سکھایا کہ عظیم اور معروف گلوکاروں میں کیا کیا خاصیت ہوتی ہے۔ جیسے کہ استاد امیر خاں صاحب، استاد بڑے غلام علی خاں صاحب وغیرہ کیوں بڑے ہیں، کیوں ان کا گانا لوگوں کو اچھا لگتا ہے، کیا خاصیت ہے، کس طرح کے ریاض سے گانے میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے مجھے ایک راستہ بتایا یہ راستہ بہت مشکل تھا لیکن اگر آپ اس پر مسلسل چلتے جائیں گے تو ضرور ہی آپ آگے بڑھیں گے اور موسیقی کی گلوکاری کا لطف اٹھا پائیں گے۔ ایک ایک سطر کی ٹائمنگ کیا ہو اس پر بہت محنت کروائی۔ انہوں نے مجھے سکھلایا کہ ''مکھ ولاس'' بہت اچھا ہونا چاہئے، کیونکہ اس سے گانا خوبصورت ہوتا ہے۔ جتنی آسانی سے گایا جائے، اتنا اچھا ہوتا ہے۔ وہ کہتی تھیں کہ چاہے شاستریہ گائیں، یا اُپ شاستری، سوگم کوئی بھی سنگیت اپنائیں، اس میں سریلا پن لگنا چاہئے۔ ان کے گھر میں موسیقی کی ایک عظیم دنیا سے میرا تعارف ہوا۔ ایک دفعہ مدھورانی جی نے مجھ سے دلی گھرانے کے استاد ہلال احمد خاں صاحب کی کمپوزیشن ''یارو مجھے معاف کرو'' سکھائی۔ تاکہ ان کے انگ کی گائیکی سے واقف ہو سکوں۔ اتفاق دیکھئے کہ بعد میں مظفر علی نے مجھے البم ''حسن جاناں'' کے لئے بلوایا تو انہوں نے یہی غزل مجھے گانے کے لئے کہا، میں نے وہی کمپوزیشن سنائی، انہیں بڑا اچھا لگا اور اسے البم میں شامل کیا۔

س: آپ مجھے اپنے البم کے بارے میں بتایئے؟

ج: جب مجھے مدھورانی دیدی کا ساتھ ملا۔ اور جب ''آروہی'' پروگرام ٹیلی کاسٹ ہو چکا تھا تو ایچ ایم وی کمپنی سے ایک دن فون آیا اور انھوں نے مجھے البم کرنے کو کہا۔ اس طرح مجھوں کا میرا پہلا البم آیا ''بھگتی سودھا'' جسے جے دیو صاحب نے کمپوز کیا تھا۔ اس کے بعد غزلوں کے تین البم آئے۔ ''التجا''، ''عشق''، اور ''تسکین''۔ ''ان میں مدھو دیدی کی کمپوزیشن تو تھی ہی ساتھ ہی کے۔ مہاویر، بھوپیندر سنگھ اور مانس مکھر جی کی دھنیں بھی تھیں۔ ان کے ساتھ گاتے ہوئے بھی میں نے بہت کچھ سیکھا۔ اس کے بعد شنکر مہادیون نے مجھے ''سمپورن سندر کانڈ'' میں گوایا۔ اور مظفر علی نے جب البم ''حسن جاناں'' تیار کیا تو اس میں بھی مجھے گانے کا موقع ملا۔ بڑے کلاکاروں کے ساتھ البم کرنے پر آپ کو بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے، مجھے بھی کافی کچھ سیکھنے کو ملا۔

س: اچھا مجھے آپ یہ بتائیں کہ آپ نے غزل کو ہی کیوں اپنایا؟

ج: اصل میں غزل میں اپنانے کی وجہ یہ تھی کہ ''اُپ شاستری'' سنگیت میں میری دلچسپی بچپن سے ہی تھی۔ بیگم اختر کو سنا تو لگا کہ کاش میں ان کی طرح گا سکتی۔ جب مدھورانی جی کے ساتھ سیکھنے کا موقع ملا تو آہستہ آہستہ غزل کی طرف رجحان گیا۔ اور کچھ تو مقدر کی بھی بات ہوتی ہے۔ نوکری کے ساتھ بہت لمبا وقت نہیں دے سکی۔ لیکن موسیقی ہمیشہ میری پیشن (Passion) رہی ہے۔

س: موسیقار جے دیو صاحب سے جڑی یادیں بتایئے؟

ج: جے دیو صاحب ایک اچھے انسان تھے۔ رحم دلی کوٹ کوٹ کر ان میں بھری ہوئی تھی۔ کچھ باتیں ایسی ہیں جنھیں میں زندگی بھر نہیں بھول سکتی ان میں سے پہلی یہ کہ جب جے دیو صاحب کو مدھیہ پردیش سرکار کا لتا منگیشکر ایوارڈ ملا۔ اس وقت ان کا ایک بڑا آپریشن بائی پاس کا ہوا تھا جس کی وجہ سے ڈاکٹروں نے ہوائی جہاز کا سفر کرنے سے منع کیا تھا اس لئے ہم لوگوں کے 15 افراد کا کارواں ریل کے سفر کے ذریعے بمبئی سے اندور کو روانہ ہوا ایوارڈ فنکشن کے لئے یہ 4 دسمبر 1986 کی بات ہے۔

میں نے 15 کمبلوں کا آرڈر دیا تھا۔ لیکن ٹرین اٹینڈینٹس نے 14 کمبل ہی لا کر دیئے۔ میں نے سارے چودہ کمبل لوگوں میں بانٹ دیئے اور میں نے خود شال سے خود کو ڈھک لیا اور سو گئی۔ جب صبح میری آنکھ کھلی تو میں نے اس ٹھنڈک میں بھی میٹھی نیند کی وجہ سمجھی۔ رات میں جے دیو صاحب نے اپنا اونی لانگ کوٹ میرے شال پر ڈال دیا تھا۔ یہ ان کی رحم دلی اور محبت تھی۔

ایک اور واقعہ مجھے یاد آرہا ہے مجھے وقت کی پابندی کا۔ جب فلم گمن کے گانے کی ریہرسل چل رہی تھی۔ اس وقت میں آکاشوانی ممبئی میں نوکری کر رہی تھی اور مجھے آکاشوانی دس بجے پہنچنا پڑتا تھا۔ اس لئے اس وقت میری روٹین بالکل مختلف تھی۔ مظفر علی صاحب ٹھیک 8:30 بجے صبح

مجھے لینے پہنچ جاتے تھے اور مجھے پہنچا دیتے تھے جے دیو صاحب کے یہاں چرچ گیٹ میں رٹز ہوٹل کے سامنے لگی کورٹ میں ۔ اور پھر ریہرسل کے بعد وہ مجھے آکاشوانی ممبئی ٹھیک وقت پر پہنچا دیتے تھے اس دوران وہاں میں مظفر علی صاحب، سبھاشنی جی اور جے دیو صاحب ہوتے تھے ۔ اگر کوئی جے دیو صاحب سے ملنے آجاتا تو اس سے معذرت چاہ لیتے اور میرے ریہرسل کو کبھی روکتے نہیں تھے ۔ میں جب بھی ان کے یہاں پہنچتی تھی تو انہیں ہارمونیم لے کر تیار بیٹھے ہوئے پاتی تھی ۔ کبھی مجھے انتظار نہیں کروایا ۔ جے دیب صاحب ایک عظیم استاد تھے ۔ انہیں معلوم تھا کہ کس سے کس طرح کام لیا جا سکتا ہے ۔ بہتر سے بہتر کسی سے کیا گوایا جا سکتا ہے اور وہ اس کا استعمال کر لیتے تھے ۔ وہ اپنے آپ میں ایک ادارہ تھے ۔

جس دوران میں مدھورانی جی سے سیکھ رہی تھی جو کہ جے دیب صاحب کی بلڈنگ میں ہی رہتی تھی ۔ جب جے دیو صاحب کو معلوم ہوا کہ میں آفس سے چھوٹنے کے بعد ان کے ہی بلڈنگ میں مدھورانی جی سے گانا سیکھنے آتی ہوں ۔ تو انہوں نے کہا کہ جب تک مدھورانی جی سے گانا سیکھنے جانے لگو تو تم کو میری کھڑکی پر رکھا ہوا ایک دودھ کا بوتل ملے گا ۔ میرا پتہ نہیں کہ جب تم آؤ تو میں گھر پر رہوں یا نہ رہوں اس لئے تم میری کھڑکی پر رکھا ہوا دودھ پی لیا کرنا ۔ یہ دودھ کا بوتل ان کی کھڑکی پر مسلسل 5 سالوں تک مجھے ملتا رہا ۔

ایک بار کی بات ہے میں نے ان کی کھڑکی سے بوتل نہیں اٹھایا ۔ ان دنوں میرا ذاتی فون نہیں تھا ۔ انھوں نے جب کھڑکی پر دودھ کا بوتل ویسے ہی رکھا ہوا دیکھا تو ان کو فکر لاحق ہوئی ۔ انہوں نے فوراً میرے پیارے دوست گلوکار ہری ہرن کو میرے گھر بھیجا کہ دیکھیں کہ کیا میں ٹھیک ہوں ۔ جب مجھ سے ہری ہرن ملنے میرے گھر گئے اور خیریت پوچھی تو میں نے کہا کہ میں ممبئی ہاسپٹل گئی ہوئی تھی کیونکہ میری ماں بیمار ہے اور ممبئی اسپتال میں بھرتی ہے ۔ ہری ہرن نے جے دیب جی کو ساری باتیں بتائیں ۔ یہ میرے سرپرائز کی بات تھی کہ دوسری صبح سات بجے جے دیو صاحب ممبئی اسپتال پہنچے ہوئے تھے ۔ میری ماں کی خبر خیریت معلوم کرنے کے لئے ۔ پورے 27 دنوں تک میری ماں اسپتال میں بھرتی رہیں اور جے دیو صاحب 27 دن تک صبح سات بجے ان کو دیکھنے ممبئی اسپتال پہنچتے رہے ۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو تکلیف ہوتی ہوگی آپ روزانہ یہ زحمت نہ اٹھائیں ۔ وہ اس پر مسکراتے ہوئے بولے زحمت کیسی ان کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی ماں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ۔ وہ مارننگ واک کرتے تھے اور روزانہ میری ماں کو دیکھنا اپنی روزمرہ میں شامل کر لیا تھا ۔ انھوں نے اسپتال کے ذمہ داران سے کہہ دیا تھا کہ اگر میری ماں کو کچھ خاص تعاون کی ضرورت ہو تو مہیا کی جائے ۔ اب کہاں ہیں ایسے لوگ ۔

”گمن“ کے بعد اکثر جے دیو صاحب سے ملاقاتیں ہونے لگیں ۔ وہ وقت کے اتنے پکے تھے کہ اگر نو بجے کا وقت دیا ہے تو ایک منٹ بھی انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا ۔ دوسری بات یہ کہ میں نئی تھی مجھ میں خود اعتمادی کی کافی کمی تھی انہوں نے مجھ میں خود اعتمادی پیدا کی ۔ ان کی عظمت یہ تھی کہ وہ سامنے والے کو یہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ ایک عظیم ہستی سے مل رہا ہے ۔ وہ بہت ہی سادگی سے رہتے تھے ۔ سادہ مزاجی ان کا شعار تھا ۔ کبھی اپنے آپ کو بڑا ثابت نہیں کرتے تھے ۔ ملنے والا یہ نہیں محسوس کرتا تھا کہ ہم کسی بڑے موسیقار سے مل رہے ہیں ۔ بلکہ لگتا تھا کہ وہ ایک بہت ہی پیارے اور سیدھے سادے انسان سے مل رہے ہیں ۔

س: میں بھی ان سے مل چکا ہوں ۔ اور ان کا ایک انٹرویو لے چکا ہوں ۔ کسی فلمی شخصیت کا وہ میرا پہلا انٹرویو تھا اور وہ بھی ایک عظیم موسیقار کا ۔ مگر ان کی سادگی ہی نے مجھ میں اتنی خود اعتمادی پیدا کی کہ میں ان سے بڑی آسانی سے انٹرویو لے سکا ۔ جس کے کچھ حصے ایک کیسٹ میں اب بھی موجود ہیں ۔ خیر آپ آگے ان کے بارے میں بتائیے ؟

ج: جب جے دیو صاحب سکھاتے تھے کسی گانے کو تو ان کے چہرے پر ایک میٹھی مسکان ہوتی تھی ۔ مجھے تو آج بھی لگتا ہے کہ کچھ تو اچھے کرم رہے ہوں گے کہ ایسے ”گنی جنوں“ کی قربت میسر ہوئی ۔ جے دیب صاحب بہت پڑھتے تھے، ان کے گھر میں کتابوں کا اتنا بڑا کلیکشن تھا کہ میں دیکھتی رہ جاتی تھی ۔ جے دیو صاحب کی نس نس میں رس، راگ کی دھارا پھوٹتی تھی ۔ ان کے گھر ”ان کہی“ بنانے کے دوران امول پالیکر آئے ہوئے تھے ۔ وہاں انہوں نے مجھے سنا اور پھر بہت برس بعد ”تھوڑا سا رومانی ہو جائیں“ میں مجھے گوایا ۔ موسیقی بھاسکر چندا ورکر جی کی تھی ۔ اس طرح میں جے دیو صاحب اور اپنے باقی بھی استادوں کی مقروض ہوں ۔ انہوں نے مجھے اتنا کچھ دیا کہ جس کا بدلہ ہم کبھی چکا نہیں سکتے ۔

س: دودھ بھارتی میں برسوں آپ نے کلاسیکل موسیقی کی بنیاد پر چلنے والا پروگرام ”سنگیت سریتا“ پیش کیا ۔ اس سے جڑی کچھ باتیں شیئر کیجئے ؟

ج: دودھ بھارتی میں آنے کے بعد میں نے ”سنگیت سریتا“ کو نیا روپ دینے کا کام شروع کیا ۔ اس وقت اناؤنسر راگ کے بارے میں بتاتے تھے ۔ پھر اس راگ کی بنیاد پر ایک کلاسیکل تخلیق اور اس راگ کی بنیاد پر بنائے گئے کسی فلم کے گیت بجاتے تھے ۔ میں نے سوچا کہ اس میں کچھ

تبدیلی لائی جائے۔ کچھ تخلیقی کام کیا جائے۔ میں نے ایک موضوع چنا اور اس پر پروگرام کو ترتیب دیا تاکہ کافی دلچسپ انداز سے لوگ موسیقی کے بارے میں واقفیت حاصل کر سکیں۔ یہ ایک طرح کا "میوزک اپریسی ایشن کورس(Music Appreciation Course) جیسا تھا تاکہ جن لوگوں کو موسیقی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہے۔ وہ موسیقی کا آہستہ آہستہ لطف اٹھا سکیں۔ حالانکہ موسیقی کی باقاعدہ تعلیم بغیر استاد کے ممکن نہیں لیکن اس پروگرام سے لوگوں کو موسیقی کی طرف بلایا جائے۔ تاکہ ہر کڑی ایک گائیڈ لسننگ سیشن(Guide Listening Session) کی طرح بنے۔

مثال کے طور پر ہم نے پنڈت وجے راگھو راؤ کی کڑی میں "ناد نادؔ" میں ہمالیہ سے لے کر کنیا کماری تک کی موسیقی کی بات کی۔ ڈاکٹر انیتا سین کی کڑی "راگ رنجن"، پنڈت اجے چکرورتی کی کڑی۔ "راگ اور دھن میں بھید"، پنڈت ہری پرساد چورسیا، پنڈت شیو کمار شرما اور زرین شرما کی کڑی، "پارشو سنگیت کے رنگین تانے بانے"، "راہل دیب برمن گلزار اور آشا بھوسلے کی کڑی "میری سنگیت یاترا"۔ جس میں گانے بننے کی کہانیاں سامنے آئیں۔ یہ بہت یادگار پروگرام بن گیا۔ انل بسواس کی کڑی "ری کیٹو" استاد ذاکر حسین کی کڑی "طبلہ اور اس کا باج"۔ بیگم اختر پر مرکوز کڑی۔ یہ سارے پروگرام آج بھی سامعین کے ذہن میں تازہ ہیں۔

س: آج کل کی نئی نسل کلاسیکل موسیقی سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے لئے کیا کرنا ہوگا؟

ج: میں یہ نہیں مانتی کہ آج کی نئی نسل کلاسیکل موسیقی سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ بچے جاننا سمجھنا چاہتے ہیں۔ لیکن آکاشوانی کے علاوہ کسی بھی چینل سے کلاسیکل موسیقی کے مخصوص پروگرام نہیں سنائی پڑتے۔ اس کے لئے ہماری نئی نسل کو ہمارے اساتذہ کی ریکارڈنگ سنوائی جانی چاہئے۔ اسکولوں میں شروع سے ہی کلاسیکل موسیقی سنوانے کا پروگرام ہونا چاہئے۔ بہت دلچسپ طریقے سے چھوٹی چھوٹی کلاسیکل چیزیں سنوائی جانی چاہئے۔ اگر وہ ہمیشہ پاپولر فلمی موسیقی سنتے رہیں گے تو پھر کلاسیکل موسیقی سننے کا صبر ان کے اندر پروان نہیں چڑھے گا۔ والدین کو بھی چاہئے کہ وہ گھر پر دس پندرہ منٹ بچوں کو بیٹھا کر کلاسیکل موسیقی سنائیں۔ یہ کوششیں آگے چل کر بہت بڑی تبدیلی لا سکتی ہیں۔ کیونکہ آپ جیسا سنتے ہیں ویسا ہی آپ کا ٹیسٹ یا مزاج بن جاتا ہے۔

□□□

Sadre Alam Gauhar
1138/1155 Azmi Nagar
Nalapar, Near Golden Saloon
Bhiwandi, District Thane-421305 (M.S)

فرہنگ آصفیہ سے

آخری چہار شنبہ ۔ ف۔ اسم مذکر۔ آخری بدھ۔ صفر کے مہینے کا آخری بدھ۔ چونکہ اس روز مسلمانوں کے پیغمبر ﷺ نے بڑی سخت بیماری سے افاقہ حاصل کر کے غسل صحت فرمایا تھا اور ذرا چلے پھرے تھے۔ اس سبب سے اس دن بڑی خوشی منائی جاتی اور مسلمان اس دن سبزہ روندنا اور باغوں میں پھرنا نہایت مبارک سمجھتے ہیں۔ استاد بچوں کو عیدیاں دیتے اور ان سے اس خوشی کا انعام لیتے ہیں۔ کل مسلمان دستکار اور حرفت پیشہ آدمی اس تہوار کو اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں۔ اور چھٹی مناتے ہیں۔

قلعہ معلی کے آخری چہار شنبہ کا نظارہ ۔صفر جسے تیرہ تیزی کا مہینہ کہتے ہیں اس مہینے کی تیرہ ہوئی تاریخ ہوئی دیکھو اچھے کی سلونی گھنگنیاں نون مرچ ڈال کے اور گیہوں کی پھیکی گھنگنیاں ابال کے اوپر خشخاش اور کھانڈ چھڑک کے قابوں میں نکال کے نیاز دی پھر بانٹ دیں۔ اسی مہینے کے آخری بدھ کو بادشاہ نے صبح دربار کیا۔ دیکھو جواہر خانے کا داروغہ سونے چاندی کے چھلے چاندی کی کشتی میں لگا کر لایا۔ چار چھلے اس میں سے دو سونے کے دو چاندی کے بادشاہ نے آپ لئے دو ولیعہد کو ایک ایک اور شاہزادوں کو اپنے ہاتھ سے دیا۔ باقی اور امیر امراؤں کو تقسیم ہو گئے۔ سب نے مجرا کیا۔ نذریں دیں دربار برخاست ہوا۔ بادشاہ اپنی بیٹھک میں آئے۔ وہ چاروں چھلے جو آپ لئے تھے ملکۂ زمانی کو دئیے تیسرا پہر ہوا۔ دیکھو کوری کوری ٹھلیاں آئیں۔ پہلے ایک ٹھلیا میں تھوڑا سا پانی اور ایک اشرفی کپڑے میں لپٹ کر اس میں ڈال بادشاہ کے آگے کھڑے ہو کر سر پر سے اتار کے پھینک دی او ہو ہو!!!۔ وہ پڑاق سی ٹھلیا ٹوٹ گئی اشرفی حلال خوری اٹھالے گئی۔ اہلو! اب تھوڑا سا بھوس لا کر جلایا۔ بادشاہ نے اسے لاندا۔ لو اب بیگماتوں اور شہزادوں کو ٹھلیاں تقسیم ہونے لگیں کسی ٹھلیا میں پانچ کسی میں چار کسی میں دو روپے کسی میں ایک ہی روپیہ ڈال کہاریوں کے سر پر رکھو اجسو لینوں کو ساتھ لے کر سب کے پاس بھیج دیں سب نے ان کو انعام دیا اور ٹھلیاں رکھ کر اسی طرح کھڑے ہو کر توڑ دیں۔ جو کچھ ٹھلیوں میں تھا وہ حلال خوریاں لے گئیں تیسرے پہر سبزہ روندنے باغ میں گئے۔ آخری چہار شنبہ کی عیدیاں شاہزادوں کے استاد سنہری روپہلی پھول دار کاغذ پر لکھ کر لائے۔ شہزادوں کو عیدیاں اور چھٹی دے۔ عیدیوں کے روپے لے رخصت ہوئے۔

شاعرات کے منتخب اشعار

کائی لگی دیوار کی خوشبو، چاند، شفق
جب تم تھے تو سب کچھ اچھا اچھا تھا
مرے وجود پہ وہ بن کے اوس کیا برسا
زمیں سے آنے لگی مجھ کو آسماں کی مہک

رشیدہ حیاں

ہر دل عزیز وہ بھی ہے ہم بھی ہیں خوش مزاج
اب کیا بتائیں کیسے ہماری نہیں بنی
دیوار و در میں سمٹا اک لمس کانپتا ہے
بھولے سے کوئی دستک دے کر چلا گیا ہے

بلقیس ظفیر الحسن

شہر میں، دشت میں گلزار میں کب جاتی ہے
میری آواز مرے گھر ہی میں دب جاتی ہے
بغاوتوں کو کچلنا ہی فرض ٹھہرا تو
امیرِ شہر مرے گھر سے ابتدا کرتا

رفیعہ شبنم عابدی

لے اڑا مجھ کو سرِ راہِ گزر کس کا خیال
کچھ بھی اب یاد نہیں ہے کہ کدھر جانا تھا
کس طرح اس کی ہر اک پتھر مزاجی کا غرور
میں نے شیشے میں اتارا یہ کہانی پھر سہی

سیدہ شانِ معراج

میں اپنی ذات سے کیوں کر اسے الگ سمجھوں
کہ میری روح کے اندر اتر گیا ہے کوئی
یوں بھی ہوتی ہے کبھی پرسشِ احوالِ حیات
بھیگی آنکھوں سے ہر اک لفظ ادا ہوتا ہے

مسعودہ حیات

گو خوف سے عذاب کے لرزی ہوئی تھی میں
لیکن ترے کرم کو بھی پہچانتی تھی میں
توبہ کے ہیں کچھ پھول تو کچھ اشکِ ندامت
سوغات لیے بیٹھی ہوں آتے ہی نہیں وہ

بیگم رضیہ حلیم

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا
یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں
میں آندھیوں کے پاس تلاشِ صبا میں ہوں
تم مجھ سے پوچھتے ہو مرا حوصلہ ہے کیا

ادا جعفری

یہ جاگتی ہوئی آنکھوں کی لو ڈراتی ہے
مری شبوں سے کسی خواب کا گزر ہوتا
ہر سانس انتظار ہے ہر گام اضطراب
شاید بلا رہی ہے تری رہ گزر مجھے

ساجدہ زیدی

وہ اک نگاہ کہ ہے چارہ گر بھی قاتل بھی
نہ جانے کتنوں کو جینا سکھا گئی ہوگی
وہ اک نگاہ جو اتری تھی حرفِ کُن کی طرح
ہمارے دل میں سمائی تو کائنات ہوئی

ممتاز مرزا

ایک زندانِ حوادث میں ہے پابستہ حیات
فکرِ آوارہ سے پوچھو کہ کدھر جائے گی
یہ کس نگر میں آ گئے یہ کون سا مقام ہے
سیاہیوں کی دوپہر تمازتوں کی شام ہے

زاہدہ زیدی

غوث النساء

عصمت چغتائی کا ناول 'معصومہ' تانیثیت کے تناظر میں

یوں تو طبقہ نسواں ابتداء سے ہی ادب کا موضوع رہا ہے لیکن عصمت نے جس طرح اس موضوع کو ایک نئی معنویت کے ساتھ پیش کیا اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔انھوں نے بے زبان عورتوں کو قوت گویائی عطا کرتے ہوئے ان کے درد کا مداوا نہایت بے باکانہ انداز میں کیا ہے۔ویسے عصمت کا بنیادی موضوع تانیثیت نہیں ہے اور نہ وہ اپنی تحریروں میں اس فلسفے اور تھیوری کا جھنڈا بلند کرتی نظر آتی ہیں۔البتہ تانیثی ذہن اور تانیثی شعور اور ادراک ان کی تحریروں میں صاف جھلکتا ہے۔ترنم ریاض ان کے بارے میں لکھتی ہیں:

''عصمت کی تحریریں تانیثی ادب کا وہ پہلا سنگ میل ہیں
جہاں سے مردوں کے عائد کردہ اصولوں اور صدیوں سے
تیار کردہ فیصلوں کے خلاف یلغار کا راستہ شروع ہوتا ہے۔
ان کی تحریریں تانیثی حسیت اور تانیثی شعور کا پہلا تجربہ
ہے۔''

عصمت چغتائی نے سماج کے کمزور طبقے پر کیے جانے والے ہر طرح کے جبر و استحصال کے خلاف اپنا قلم اُٹھایا اور چونکہ عورت ہمارے سماج کا ایک کمزور طبقہ مانا جاتا ہے،اس لیے عصمت چغتائی نے عورتوں کے جبر و استحصال کے خلاف شدید احتجاج اپنی کہانیوں سے کیا ہے اور ان کہانیوں کے ذریعے حقیقت کو سامنے لانے کی کوششیں کی ہیں۔ عورت خواہ کسی بھی طبقہ سے تعلق رکھتی ہو وہ مرد کے جبر و استحصال کا شکار ہے۔ عورت کے حق میں عصمت کے شدید جذبے اور ان کے احتجاج کے باعث انھیں نسوانی یا تانیثی تحریک کی پیش رو بھی کہا جاتا ہیں۔عصمت نے ایک مخصوص معاشرے کے استحصالی نظام اور تفریق سے بھرے ہوئے سماج کی تابع عورت کی کمزوری اور حالات کی ستم ظریفی کو اس کی نارسائی اور پسپائی کے حوالے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے ان کی خصوصی توجہ اقتصادی بدحالی، معاشرتی فرسودگی توہم پرستی اور جہالت پر مرکوز رہی ہے، انھوں نے عورت کی مکمل شخصیت اور سماجی،سیاسی، اقتصادی اور معاشی حیثیت کو اپنے ناولوں کا مرکز و محور بنایا ہے جس سے نہ صرف معاصر ناول نگار متاثر ہوئیں بلکہ آنے والی نسلوں نے بھی ان کی پیروی کی ہے۔

عصمت نے اپنے ناولوں میں سماجی وسیاسی رجحانات کی عکاسی کی ہے۔سماج کی تشکیل میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی زبردست اور اہم رول ہوتا ہے لیکن برسوں سے سماج میں عورتوں کو وہ درجہ نہیں دیا جارہا ہے جس کی وہ مستحق ہیں۔عصمت نے عورتوں کے سماجی حالات پر خاصی توجہ دی ہے اور ان کی نفسیاتی اور جذباتی کشمکش اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ان پر ہونے والے مختلف قسم کے ظلم وستم کو بھی دکھایا ہے۔انھوں نے عورتوں کے ظلم واستحصال کے خلاف نہ صرف قلم اُٹھایا بلکہ اسے بغاوت کی شکل میں منتقل کردیا۔

''معصومہ'' عصمت چغتائی کا تیسرا ناول ہے جو 1961 میں شائع ہوا۔یہ ناول ممبئی کے حالات پر لکھی گئی ہے، اس ناول میں معاشرے میں پھیلی ہوئی معاشی اور اقتصادی بدحالی کو بنیاد بنایا گیا ہے اور یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح ایک معصوم لڑکی معصومہ اپنی معاشی بدحالی کی وجہ سے گناہوں کے دلدل میں پھنس جاتی ہے اور اس کی مجبوریوں کا فائدہ اُٹھا کر معاشرے کے ٹھیکیدار اس کا جنسی استحصال کرتے ہیں۔ اس ناول میں بڑے بڑے گھرانوں، فلمی

ڈائرکٹروں، پروڈیوسروں، سرمایہ داروں اور ان کے ساتھیوں کا حال بھی بیان کیا گیا ہے۔ ممبئی کے مختلف تاریک گوشوں کو نہ صرف منظر عام پر لایا گیا بلکہ ان کی مجرمانہ زندگی کی بھرپور عکاسی بھی کی گئی ہے۔ عصمت نے معصومہ کے جنسی استحصال کی صورت میں نہ صرف ہندوستان کے ان اَن گنت گھرانوں کی داستان بیان کی ہے بلکہ یہ ایک ایسی لڑکی کی دُکھ بھری کہانی بھی ہے جس کو زندگی کے ناسازگار حالات نے معصومہ سے نیلوفر (طوائف) بنا دیا ہے۔

اس ناول کا مرکزی خیال یہ ہے کہ عورت کو طوائف بنانے اور بدی کی راہ پر ڈالنے والے معاشی حالات اور سماج کے ذلیل لوگ ہوتے ہیں۔ جسم فروشی مردانہ اقتدار پر مبنی سماج کی وہ لعنت ہے جو ہر دور اور دیار میں موجود رہی ہے۔ آج بھی کئی ایسے ممالک ہے جہاں کچھ قبیلوں میں عورتیں جسم فروشی کی خاطر بیچی اور خریدی جاتی ہیں۔ اس طرح نہ صرف عورت کی حیاتیاتی و جسمانی محکومیت کو بڑھاوا ملتا ہے بلکہ اس کی نفسیاتی اُلجھنوں میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور سب سے زیادہ جسم فروشی کی لعنت کو بھی تقویت مل جاتی ہے۔ اس ناول کے ذریعے سماج کے دولت مند طبقے کی جھوٹی شرافت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا سماج ہے جہاں صاحب دولت سماج کے ٹھیکے دار بنتے ہے اور اپنی دولت کے بل بوتے پر سماج کے قوانین بناتے ہیں اور مزدور طبقے کا جی بھر کر استحصال کرتے ہیں۔ یہاں تک یہ سماجی ٹھیکیدار اپنی دولت کی آڑ میں دوشیزاؤں کی عصمت اور خاندان کی شرافت کو بھی روندڈالتے ہیں، لیکن انھیں اپنی زیادتی کا احساس بھی نہیں ہوتا، انھیں قانون کی طرف سے کوئی سزا بھی نہیں ملتی کیوں کہ ان کے پاس دولت وحشمت، ناموری اور اثر رسوخ ہوتا ہے۔

اس ناول کی کہانی کچھ یوں ہے کہ معصومہ کے والد حیدر آباد دکن کے ایک معزز شہری تھے اور قاسم رضوی کی فوج میں عہدے دار تھے۔ حیدر آباد کے زوال سے پہلے، خطرے کی گھنٹی سنتے ہی معصومہ کے والد اپنے بڑے بیٹوں کے ساتھ، روپیہ، قیمتی زیورات اور مکانوں کے کاغذات لے کر کراچی بھاگ جاتے ہیں اور گود کا چھوٹا بیٹا سلیم اور تینوں لڑکیوں کو بیگم صاحبہ کے پاس چھوڑ کر اسے جلد بُلانے کے لیے کہہ دیتا ہے۔ بیگم صاحبہ پہلے تو گزارے کے لیے گھر کے سامان کو فروخت کرتی ہیں، پھر زیورات بیچتی ہیں مگر کبھی بھی پاکستان سے ان کے شوہر کا کوئی بلاوا نہیں آتا۔ لمبے عرصے کی خاموشی ایک خط کے ذریعے ٹوٹ جاتی ہے جس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ان کے شوہر نے پاکستان میں انیس سالہ کی ایک لڑکی سے شادی کر لی ہے اور ان کے بیٹے بھی اپنے الگ گھر بسا چکے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے شوہر نے لکھا تھا کہ وقت پڑنے پر وہ بیگم صاحبہ کو طلاق بھی دیں گے۔ اس حادثہ سے بیگم صاحبہ کو بہت گہرا صدمہ پہنچتا ہے اور وہ اندر سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ اس غم و غصے کا اظہار تو وہ رو پیٹ کر کرتی ہے اور مرد سماج سے اپنا حق مانگتی ہے۔ اپنا سہاگ مانگتی ہیں، انصاف مانگتی ہیں مگر ان کی یہ فریاد اور آواز مرد سماج کے کانوں تک نہیں پہنچتی۔ وہ روتی ہیں، گڑ گڑاتی ہیں مگر بہت جلد ہی وہ مرد سماج کے سامنے رونا مناسب نہیں سمجھتی اور تب ان کے زخمی ضمیر کے اندر سے ایک نئی اور باغی عورت کا جنم ہوتا ہے جو روتی نہیں، اور کسی سے اپنا حق مانگتی نہیں بلکہ اپنا حق اس مرد سماج سے جائز یا ناجائز طریقے سے چھین لیتی ہے چاہیے اس کے منفی اثرات ہی کیوں نہ ہو۔

''معصومہ'' اس جابر مردانہ سماج میں جنسی اور معاشی استحصال کا شکار ہو جاتی ہے اور اسے اس معاشرے میں جنسی اور معاشی ہوس کی تکمیل کا ذریعہ اور خریدنے بیچنے والی اشیاء سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھا کر صاحب دولت وحشمت اسے اپنے جسم کی آگ بجھانے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ تقسیم ہند کے دوران معصومہ کے عیاش باپ کی مکاری اور شاطرانہ مزاج نے بیٹی کو طوائف کے کوٹھے پر پہنچا دیا اور خود پاکستان میں انیس (19) برس کی لڑکی کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا اور یہاں کی بیوی بچوں سے غافل ہو جاتا ہے۔ گھر کی مالی حالت کی ابتری اور احمد بھائی کا ہوس اسے ناکام ہیروین سے طوائف اور پھر خرید و فرخت کی اشیا بننے پر مجبور کر دیتی ہے۔

معصومہ کی ماں جب اپنے بچوں کے ساتھ ممبئی کا رُخ کرتی ہیں۔ وہاں ان کے جاننے والے احسان صاحب نکل آتے ہے جو ان کی معاشی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے معصومہ کو بُرائی کے راستے پر لگا دیتا ہے۔ شروع میں بیگم صاحبہ اس تجویز سے انکار تو کر دیتی ہے لیکن جب وہ چاروں طرف سے اس دلدل میں پھنس جاتی ہے اور ہاتھ پیر مارنے کی کوشش سے بجائے باہر نکلنے کے اور نیچے دھنسنے لگتی ہے تو وہ ہتھیار ڈال دیتی ہے اور دوسری طرف مرد معاشرے سے بدلہ لینے کے لیے وہ زندگی کے اس موڑ پر اپنی بیٹی معصومہ کو طوائف اور خود نائکہ بن جاتی ہے۔

یہ معصومہ وہ لڑکی ہے جو تین بیٹوں کے بعد پیدا ہوئی تھی جو ماں باپ کی بہت لاڈلی تھی اور بہت ذہین بھی تھی جسے بہت سارے شعر بھی

یاد تھے، بیت بازی میں ہمیشہ اس کی پارٹی اول آتی تھی جسے قہقہے اور کیٹس سے عشق تھا۔ والدین کی تمنا تھی کہ بیٹی سینئر کیمبرج کرے اور اس کی شادی کسی آئی۔سی۔ایس سے کی جائے لیکن حالات نے کہیں کا نہ چھوڑا ممبئی میں جب چھ سات مہینوں کا کرایہ ادا نہ ہوا، جب قرض میں بال بال جکڑ گیا تو حالات کے جبر اور تنگدستی کی شکار ہو کر ممبئی کے سیٹھوں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں کا کھلونا بن جاتی ہے۔معصومہ کے جسم فروش بننے میں اس زوال آمادہ نوابی معاشرے کا بڑا ہاتھ تھا جو عیاشی کے دلدل میں پھنسا ہوا تھا اور جہاں یہ سب کچھ مذہب اور شرافت کی آڑ میں فروغ پا رہا تھا۔عصمت کا یہ اقتباس:

''مطع وہ ماحول تھا جس میں بیگم پلی تھیں، روزے بھی تھے، نمازیں بھی تھیں، حج اور زکوۃ بھی۔مگر اس کے ساتھ چھپ کر رنڈی بازاری اور حرام کاری بھی تھی۔ دنیا کی نظر سے چھپا کر جو عیب کیے جائیں ان سے اور کوئی نہیں مگر اولاد تو واقف رہتی ہی ہے۔ حضور اعلیٰ کی کتنی بیویاں، باندیاں، داشتائیں تھیں۔کیا سب کو خوش رکھنا ان کے بس کی بات تھی؟ مگر سب ہی زندہ تھیں اور انسان تھیں۔ صاحب زادیوں کی بھی شادیاں نہیں ہوئیں۔ کیا وہ سب کی سب کنواری تھیں؟ جو اس بڑھاپے میں سال میں کتنے ہی بچے ہوتے تھے، کیا ان کی ماؤں کے علاوہ کسی دوسرے کو ان کے باپوں کا پتہ نہیں معلوم تھا؟''

(معصومہ،کلیات عصمت چغتائی، ص، 54)

یہ ایسا سماج ہے جہاں عورت کے اندر کی ممتا ایثار وقربانی عیش و آرام کے عوض فروخت ہوتی ہے جہاں ماں ذرا سے پس و پیش کے بعد اپنی بیٹی کا سودا کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے اور پھر عمر کے کسی بھی لمحے میں کسی طرح کے پچھتاوے کو اپنے سامنے بھٹکنے نہیں دیتی۔یہ ایسا سماج ہے جہاں باپ کو اپنی بیٹی کی عزت کا پاس نہیں ہے۔

بیگم صاحبہ نے گھر کا خرچ چلانے، بچوں کو پالنے، مکان کا کرایہ ادا کرنے کے لیے جو راستہ نکالا وہ قابل رحم بھی ہے اور قابل حیرت بھی۔بیگم صاحبہ نے اپنی سگی بیٹی کو طوائف بنایا۔اصل میں عصمت چغتائی نے بڑی بہادری سے سماج سے یہ سوال کیا ہے کہ کیا ایک ماں اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتی ہے اور وہ بھی گھر کے خرچے اٹھانے کے لیے اور بچوں کی پرورش و پرداخت کے لیے۔ لیکن یہ ایک ایسی عورت ہے جس کے اندر مرد ذات سے انتقام لینے کا زبردست مادہ پنہاں تھا کہ لو اگر تم (19) انیس برس کی لڑکی سے شادی کر سکتے ہو تو تمہاری بیٹی بھی مجبوری میں ایک طوائف بن سکتی ہے یہ بات پورے مردانہ سماج کے منہ پر طمانچہ تھا اور جب وہ معصومہ کا سودا کر رہی تھی بالکل ایک بے باک نائکہ کی طرح ان کے اندر نہ جھجک ہوتی ہے نہ شرم وحیا۔یہ اقتباس ملاحظہ ہو

''اس دن بیگم کی خاندانی جھجک نے دم توڑ دیا۔انھوں نے حامی بھر لی۔فلیٹ بچی کے نام ہوگا۔ ایک ہزار کا بندھا خرچ ہوگا۔لڑکی بغیر ان کی مرضی کے رات کو باہر نہیں رہے گی۔شاید اس طرح انھوں نے اپنے شوہر سے بدلہ لے لیا۔ادھر وہ کسی کی انیس برس کی کونپل کو کھول رہے تھے ادھر ان کی اسی بیٹی کے دام لگ رہے تھے۔ بڑے میاں کو خبر ملے گی کہ صاحب زادی نے دھندا شروع کر لیا تو مزہ آجائے گا۔''

(معصومہ،کلیات عصمت چغتائی ،ص،14)

اوپر کے اقتباس سے بیگم صاحبہ کی جرأت مندی اور باغی رویے کا انکشاف ہوتا ہے کیوں کہ بیٹی کا سودا کر کے وہ ایک بے باک اور انتقام کی آگ میں شعلے کی طرح لپک اٹھتی ہیں۔وہ چاہتی ہے کہ جس طرح ان کے شوہر نے انھیں تکلیف پہنچائی بدلے میں وہ بھی ان کو ایسی تکلیف پہنچائیں گی کہ ان کے شوہر بھی چیخ چیخ کر روئیں اور کوئی ان کی فریاد سننے والا نہ ہو۔اور وہ نائکہ بن کر یہ فیصلہ کرتی ہے کہ فلیٹ بچی کے نام ہوگا وغیرہ وغیرہ کتنا حیرت انگیز ہے۔عصمت نے نسوانی کردار ایسے پیش کیے ہیں کہ وہ اپنے تئیں ہوئی ہر ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتی ہیں خواہ ان کے یہ اقدام مثبت ثابت ہوں یا منفی۔بیگم صاحبہ جو عام ماؤں کی طرح بیٹی کی خیر خواہ تھی مگر جب بیٹی کا سودا کر چکی تو ساری جھجک ساری شرم وحیا چھوڑ دیتی ہیں۔ اس وقت یہ دولت بٹور کر عیش کرنے والی ایک تیز طرار، مکار اور مطلب پرست عورت کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

عصمت کے کرداروں میں معصومہ شاید واحد ایسا کردار ہے جو سماج کی اپنے تئیں ناانصافیوں، ظلم وجبر اور استحصال کو محسوس تو کرتی ہے مگر اس کے خلاف ہلکی مزاحمت کے علاوہ اور کچھ نہیں کر پاتی۔معصومہ شمن (ٹیڑھی لکیر) کی طرح معاشرہ یا سماج سے انتقام نہیں لیتی بلکہ خود اذیت کا شکار بن جاتی ہے کیوں کہ معصومہ کئی ذمہ داریوں میں گھری ہوئی ہوتی ہے اس کے سامنے اس کی بہن بھائی اور اپنی بیٹی (جو سورج

مل سے ہوتی ہے) کا مستقبل بھی ہوتا ہے اس لیے وہ چارہ ناچار اسی کنویں میں پناہ لیتی ہے اور معصومہ اس بات سے بھی باخبر ہے کہ یہ معاشرہ اس کو بہ آسانی معصومہ سے نیلوفر بنا سکتا ہے لیکن نیلوفر سے واپس معصومہ بننا بہت مشکل۔ معصومہ نامساعد حالات کے ہاتھوں مجبور ہوکر طوائف کا پیشہ اختیار کر لیتی ہے اور اس انتہائی ذلت میں اس طرح ڈوب جاتی ہے کہ اسی زندگی کو اپنی قسمت سمجھ لیتی ہے اور خود کو یہ کہہ کر تسلی دیتی ہے کہ وہ معاشی ناسازگاری کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور اسکے ذہن میں مقابلے کا تصور تک نہیں آتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے خاندان کے افراد کے مستقبل سے غافل نہیں ہوتی اور نہ یہ چاہتی ہے کہ اس کی بہنیں اس کی طرح زندگی گزاریں۔ لیکن وہ خود کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتی جس کی وجہ سے اس کے کردار میں تاریکی اور قنوطیت کا عنصر نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تانیثیت کے علمبرداران حقائق پر زور دیتے ہیں کہ عورت کا معاشی طور پر خودکفیل ہونا ضروری ہے جس کی وجہ سے اس پر سے ظلم و استحصال کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ بقول نیلوفر فردوس:

> "معصومہ ایک عام ہندوستانی لڑکی ہے جو عام ذہن و دل رکھتی ہے۔ وہ ہندوستانی معاشرہ کی ایسی بے شمار لڑکیوں کی نمائندگی کرتی ہے جو سماج اور بُرے حالات کا شکار ہیں۔ وہ لڑکیاں جو گھر، بھائی بہن کے لیے قربان ہوجانے کو اپنا تہذیبی فریضہ سمجھتی ہیں، معصومہ بھی بھائی بہنوں سے محبت کرتی ہیں، ان کے روشن مستقبل کے لیے خود کو تاریکیوں کے گڑھے میں پہنچا دیتی ہے، جہاں سے نکلنا اس کے لیے مشکل ہو چکا تھا۔"

(دوماہی سبیل، عصمت چغتائی نمبر، جلد: 3، شمارہ 8-5، ص 217، مئی۔ اگست 2015)

اس ناول میں سماجی شعور کے ساتھ مردوں کی بالادستی والے اس معاشرے سے غیر انسانی ذہنیت کا پردہ فاش کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے جس میں عورتوں کی حیثیت ایک جنسی کھلونے سے زیادہ نہیں اور وہ بے بس اور لاچار خود سپردگی پر مجبور ہوجاتی ہے۔ معصومہ ایک الھڑ سی ہے اور انسانی زندگی کے جنسی پہلو سے بالکل ہی بے خبر۔ لیکن اس کے گرد ایسے ماحول و حالات کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے کہ وہ بے دست و پا ہوکر شکست قبول کر لیتی ہے۔ لیکن جہاں تک معصومہ جیسی بھولی بھالی دوشیزاؤں کی بے حرمتی کا سوال ہے۔ عصمت نے اس کے پردے میں سرمایہ دارانہ ذہنیت کو اجاگر کیا ہے جس کو ہم مارکسٹ فیمنزم کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں کیوں کہ یہی سرمایہ دار یا سماج کا دولت مند طبقہ اپنی دولت کے بل بوتے پر غریبوں اور مزدوروں کی عزت کا سودا کرتا ہے اور غریب اپنی پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اس پر رضامند ہوجاتے ہیں۔ عصمت ان تمام مسائل کا خاتمہ کرنا چاہتی تھیں تاکہ ایک پاکیزہ اور شائستہ سماج تعمیر ہو سکے جس میں عورتوں کو برابری کا درجہ حاصل ہو اور کبھی کوئی بھی شخص اپنے دولت کے بل بوتے پر کسی شخص کا جنسی یا معاشی طور پر استحصال نہیں کر پائے گا۔ بہر حال معصومہ ایسا ناول ہے جس میں سماج کے فرسودہ نظام سے ٹکرانے کی ایک مضمحل سی کوشش ہے، جارحانہ رویہ نہیں ہے اور نہ ہی شخصی آزادی کی ذاتی جد و جہد۔ تاہم اس میں تانیثیت کا پوشیدہ اظہار ضرور ہے۔

■ ■ ■

Ghausun Nisa
Research Scholar
Mahanadi Hostel, 04E
JNU, New Delhi-110067

فرہنگ آصفیہ سے

اِجارَہ۔ اِ۔ اسم مذکر (دراصل فارسی لفظ اِزارہ کا بدل ہے)۔ (۱) کرسی یا تہہ زمین سے اوپر کا حصہ جو طاقچہ تک ہوتا اور اس سے پیٹھ لگا کر بیٹھتے ہیں۔ تلیتچے سے نیچے کا حصہ۔ آغاز عمارت سے طاق تک کا فاصلہ۔

برہان قاطع اور جامع اللغات میں اِزارہ بروزن بیچارہ بنیاد سے طاقچہ تک کی حد لکھا ہے اور سروری نے اسی لفظ کو زائے معجمہ سے درج لغات کیا ہے جو غور طلب ہے مؤیدالفضلا نے بھی سروری کی پیروی کی ہے۔ ناصر الدین شاہ قاچار نے بھی اپنے سفر نامہ میں ازارہ استعمال فرمایا ہے۔ لیکن بعض لُغات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں کے نزدیک اِزارہ بھی درست ہے۔ چونکہ عربی زبان میں ازار تہہ بند اور پائجامے کو کہتے ہیں۔ اور یہ مکان کا زیریں حصہ ہوتا ہے۔ عجب نہیں کہ اسی سے ازارہ کرلیا ہو کیونکہ معماروں کی اکثر اصطلاحیں عربی زبان سے ماخوذ ہیں۔ اس خیال سے عجب نہیں جو فارسی والوں نے تہہ بند کی مشابہت سے ازارۂ دیوار یا مکان بنالیا ہو۔

شاذیہ تمکین

ہندوستانی تصورِ تانیثیت

تانیثی تحریک نے دنیا کے مختلف ممالک میں ان کی ضروریات کے مطابق شکل اختیار کی ہے۔Kamla Bhasin کہتی ہیں کہ:

"I believe Feminism has been and should be like a water. Water takes the shape of the pot it is put into."

(http://www.youtube.com/watch?v=GlGjq3dGeJl&t=2031s)

ہر ملک میں عورت کے معاشرتی، سیاسی اور معاشی حالات، تعلیم، رسم و رواج، طبقاتی درجوں کے تحت نسائی مطالبات سامنے آئے ہیں۔ مگر چند ایسے مطالبات بھی موجود ہیں جو عالمی حیثیت رکھتے ہیں کیوں کہ عورتوں کے مسائل اور ان کے خلاف امتیازی رویہ مشرق و مغرب دونوں خطوں میں نظر آتا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ صدی قبل مغربی خاتون ووٹ ڈالنے، جائداد کی ملکیت اور اپنی مزدوری کا معاوضہ حاصل کرنے سے محروم تھی۔ زندگی کے ہر شعبے میں مساوی حقوق حاصل کرنے میں اسے کافی جدو جہد کرنی پڑی۔ آہستہ آہستہ اپنے حقوق کی لڑائی لڑتے ہوئے اس نے قانونی، سیاسی، معاشی میدانوں میں اپنی قابلیت کو منوایا۔ آج بھی اس کی یہ لڑائی جاری ہے کیوں کہ زیادہ تر حقوق حاصل کرنے کے باوجود کچھ بنیادی مطالبات آج بھی سر اٹھائے کھڑے ہیں۔

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو ہندوستانی عورت اپنے حقوق سے آگاہ ہے۔ اور اس کے حصول کے لیے کوشاں بھی نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں تانیثی تصورات کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مغرب سے مستعار ہیں۔ مگر ہندوستانی عورت نے اپنے حقوق کی آگہی کا جو سفر ویدک عہد سے لے کر اب تک طے کیا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی عورت کا تانیثی نظریہ کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ رگ وید کو تصنیف کرنے والوں میں جو بیس عورتوں کے نام شامل ہیں ان کا ادبی شعور اور تعلیمی آگہی ان کے تانیثی شعور کے ضامن ہیں۔ ویدک عہد میں Yajnavalkya سے پوچھے گئے ایک ویدک اسکالر گارگی کے دقیق اور پیچیدہ سوالات اس کے تانیثی شعور کی گواہی دیتے ہیں۔ کملا بھسین (Kamla Bhasin) اس کے متعلق اپنی ایک تقریر میں کہتی ہیں:

"Even a feminism was western but it was a good idea, I would accept it. Political ideology of marxism came from there we had adopted it. Feminism is not western it is local.......At Mahatma Buddha's time women went and said, Buddha! we want to join your Sangha. He said no First, women did not go back. They went to Ananda and said, see, your director is saying we can't join. Then Ananda went to Mr Buddha and said, "Buddha! woh to hadtal kar rahi hain, woh nahin jayengi." 2500 hundred years ago in India, debate taking place for women's rights within

religion......After this debate Budhdha said, You may join......he took a revolutionary step of allowing women to come in. So, for me Buddha is feminst and those five hundred women who went the Buddha, were feminst fighting for their rights.

(http://www.youtube.com/watch?v=GlGjq3dGeJI&t=2031s)

سمراٹ اشوک کی بیٹی سنگھ متر ا پہلی مبلغ خاتون تھی جو بدھ کی تعلیمات کی تبلیغ کی غرض سے سری لنکا تک گئی تھی۔ جین مت کے چوبیس گروؤں میں ویدیا کی راج کماری ملی بھی شامل تھی اور اگر مشرقی تناظر میں دیکھا جائے تو حضرت محمدؐ پہلے انسان ہیں جنہوں نے چودہ سو سال پہلے مردانہ بالادستی (Petriarchy) کے خلاف مہم چھیڑی۔ چودہ سو سال پہلے کہاں تھا مغرب اور کہاں تھے ان کے حقوق؟ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے صحیح معنوں میں عورت کو اس کے حقوق سے روشناس کرایا اور روایتی قانون کے خلاف پہلی احتجاجی لے وہیں سے سنائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے ذیل کے بیان سے مشرقی عورت کے احساس اور مطالبے کی بہترین عکاسی ہو رہی ہے:

"عورت نہ تو اپنے بنیادی وظیفۂ حیات سے منکر ہے نہ اخلاقی قیود سے آزادی کو اپنی منزل قرار دیتی ہے۔ سوال صرف اس ذہنی نشوونما اور ارتقا کا ہے، جس کا حق مرد وزن کو یکساں طور پر فراہم کیا جانا چاہیے۔ عورت کو بھی اپنی ذات کی تکمیل اور شخصیت کے اظہار کے وہ تمام مواقع ملنے چاہئیں جو اب تک صرف مرد کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔"

(مشمولہ: پاکستانی اردو افسانہ نگار خواتین کے افسانوں میں نسوانی کردار، فوزیہ رانی، ص۔49)

ہندوستانی عورت اپنے بنیادی فرائض سے قطعاً منکر نہیں ہے۔ یہ وہ فرائض ہیں جو مرد و مقابل صنف ہونے کے ناطے ایک منظم معاشرے کی تکمیل کے سبب اس کی شخصیت کے ساتھ منسلک ہیں۔ ان فرائض کے تئیں وہ ہمیشہ باشعور رہی ہے مگر مرد بالادست سماج میں اسے ہمیشہ ثانوی درجہ ملا۔ اس لیے وہ عزتِ نفس اور اپنی ذہنی و فکری آزادی کے تشخص کی صدا بلند کرتی ہے جو ایک انسان کی حیثیت سے اس کا حق ہے۔

تانیثی فکر پر عورتوں کی اجارہ داری ضروری نہیں۔ مرد بھی اس نظریے کے حامل اور ان کے حقوق کے حصول میں معاون ہو سکتے ہیں۔

جدید ہندوستان میں انگریزوں کی ماتحتی میں سب سے پہلے عورتوں کی فلاح و بہبودی کے لیے صدا بلند کرنے والے مرد حضرات ہی تھے جن کی کوششوں سے مختلف تحریکات وجود میں آئیں جن میں 'برہمو سماج اور آریہ سماج' نے نمایاں کام انجام دیا۔ راجا رام موہن رائے، ایشور چندر ودیہ ساگر، کیشپ چندر سین وغیرہ روشن خیال اور باشعور مردوں کی انتھک کوشش اور بے لاگ مخالفتوں کی وجہ سے 1829 میں ستی کے خلاف اور 1856 میں بیواؤں کی دوسری شادی کی حمایت میں قانون پاس ہوا۔ مسلمانوں میں عورتوں کے حقوق کے تئیں بیداری کی تھوڑی سی لہر سر سید احمد خان کی تحریک کے بعد پیدا ہوئی۔ اگرچہ سر سید عورتوں کی جدید تعلیم کے حق میں نہیں تھے مگر سر سید کی علی گڑھ تحریک کے زیر اثر جو تعلیم یافتہ طبقہ سامنے آیا اس میں آگے چل کر یہ شعور بیدار ہوا کہ عورت معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ سماجی اور سیاسی بیداری کے پہلو بہ پہلو ادبی دنیا میں بھی تانیثی تصور کے اثرات صاف جھلک رہے تھے۔ اردو ادب کی بات کی جائے تو یہاں بھی پہل مرد ادیبوں نے ہی کی۔ سب سے پہلے عورت کو ایک محبوبہ کے چولے سے نکال کر ایک ماں، ایک بہن، ایک بیٹی اور ایک بیوی کی حیثیت سے دنیائے شاعری میں متعارف کروانے والے خواجہ الطاف حسین حالیؔ ہیں۔ نظم 'چپ کی داد' کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں:

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھی قوموں کی عزت تم سے ہے

صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوستانی عورت کے حقوق کی حفاظت (اور یاد رکھیے یہاں مسلمان عورت کا سوال نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی ہر عورت کی حمایت پیش نظر ہے) سب سے پہلی آواز جس شخص نے بلند کی اور اس کی سماجی مظلومی کا سب سے پہلے اعتراف کیا اور اس کی حمایت کا علم اٹھایا، وہ حالیؔ ہی تھے۔"

(صالحہ عابد حسین، یادگار حالی، ص۔227)

ہندوستانی عورت کے لیے تانیثیت سے مراد مرد دشمنی بالکل نہیں ہے بلکہ عورت کے استحصال کا رویہ قابل مذمت ہے چاہے ان رویوں کو اپنانے والے مرد ہوں یا عورتیں، تانیثیت دونوں کی مخالفت کرتا ہے۔ ہندوستان میں ایسے ہزاروں گھر موجود ہیں جہاں خواتین کا استحصال خواتین ہی کرتی ہیں عموماً جس کی ابتداء بہو کے گھر میں قدم رکھتے ہی ہو جاتی ہے۔ تانیثی تصور کے علم بردار ان خواتین کے خلاف بھی علم بغاوت

بلند کرتے ہیں۔

تانیثی تصور کے علم بردار مثبت معاشرتی قدروں کو مسمار نہیں کرنا چاہتے بلکہ ان اقدار کا خاتمہ چاہتے ہیں جو عورت کے حقوق کی پامالی کے ذمہ دار ہیں۔ جس طریقے سے عورت کا استعمال ہو رہا ہے ان کو غلام بنانے کی جو تدبیریں کی جارہی ہیں ان سے عورت کو اپنی فطری صلاحیتوں کی آگہی اور پیش کش کا موقع نہیں مل رہا ہے صرف یہی نہیں بلکہ اس کا اثر پورے معاشرے پر بھی پڑ رہا ہے جس سے معاشرہ انتشار کی طرف گامزن ہے۔ کیوں کہ ایک مثالی معاشرے کی تشکیل میں مرد وزن دونوں برابر کے ذمہ دار ہیں، اس لیے عورت کو اس کا جائز مقام اور عزت نہ دینے کے باعث معاشرے کا استحکام اور بنیادی انسانی قدروں کا تحفظ خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اس لیے عورتوں کے حقوق کی لڑائی لڑنے والے ہندوستانی تانیثی تصور کے علمبردار جن میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں اپنے اخلاقی قیود میں رہ کر ہندوستانی عورت میں اپنے حقوق کے تئیں شعور و بیداری پیدا کرنے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ جس میں سب سے پہلے قدیم عہد سے چلی آرہی ستی کا رواج اور بیوہ کی دوسری شادی نہ کرنے کی رسم کی مخالفت کی گئی جس کے سبب 1829 میں ستی کے خلاف اور 1856 میں بیواؤں کی دوسری شادی کی حمایت میں قانون پاس کیا گیا۔ ان دانشوروں کے ذریعہ علاقائی اعتبار سے بھی ان انسان سوز رسموں کے خلاف مہم چلائے گئے۔ مکمل طور پر نہ سہی مگر کہیں کہیں بیداری کا جذبہ بھی پیدا ہونے لگا۔ انہیں کوششوں کا ثمرہ تھا کہ کشمیری پنڈتوں کے فرقے میں پہلی مرتبہ ایک بیوہ لڑکی کی شادی آگرہ میں ہوئی۔ اس اصلاح کی تعریف اور خیر مقدم میں چکبست نے نظم 'برق اصلاح' تحریر کی۔ اس نظم میں معاشرے میں رائج بیوہ کے عقد ثانی کے خلاف رسم کی مذمت کرتے ہوئے نئے دور میں بدلے ہوئے حالات اور قومی مصلح کی تعریف میں قصیدہ خوانی کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر چہ اس عمل سے کہنے کو دین و مذہب برباد ہوا مگر ہمیں اس کا کوئی دکھ نہیں ہے۔ ہماری خوشی یہ ہے کہ انسان کی آزادی کا بت صحیح سلامت رہے۔ اس نظم کا ابتدائی حصہ ملاحظہ ہو۔

مرحبا جرأت اصلاح دلانے والو
قوم کے بارِ امانت کے اٹھانے والو
دل کی اجڑی ہوئی نگری کے بسانے والو
مادر ہند کی بگڑی کے بنانے والو
کے طوفاں میں دیا ہے یہ سہارا تم نے
خوب ڈوبی ہوئی کشتی کو ابھارا تم نے

اسی درمیان عورتوں کی تعلیم کو بھی ضروری گردانتے ہوئے حقوق نسواں کے حامیوں نے تعلیم نسواں کو عام کرنے کی کوشش کی۔ پونے میں 1848 میں لڑکیوں کے اسکول کی سب سے پہلی شروعات ساوتری بائی پھولے سے ہوئی تھی۔ اس وجہ سے انہیں جدید ہندوستان کی سب سے پہلی فیمنسٹ مانا جاتا ہے۔ تخلیق کاروں کے یہاں بھی تانیثی تصورات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اردو شاعری کی بات کی جائے تو حالی اپنی نظم "نظم چپ کی داد" میں مرد کی اس ذہنیت کہ عورت تعلیم سے نا آشنا رہے کے پیچھے پوشیدہ اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے عورت کو شعوری طور پر بیدار کر رہے ہیں کہ:

دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب
تم پر مبادا علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں
ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق
تعلیم پا کر آدمی بننا تمہیں زیبا نہیں

ہندوستان میں عورت کے مسائل اور مطالبات اس کے اپنے ماحول اور اقدار سے متعلق ہیں۔ یہاں کی عورت اخلاقی قید سے بالاتر آزادی کی خواہاں نہیں۔ وہ مغرب کی نسائی تحریک کی علمبرداروں کی طرح ایسی جنسی آزادی کی خواہش مند بالکل بھی نہیں ہے جس سے وہ بے راہ روی کا شکار ہو جائے۔ یہاں کی عورت مرد کی رقابت کے بجائے اس کی رفاقت کی خواہاں نظر آتی ہے۔ رفیعہ شبنم عابدی کی نظم 'نصف بہتر' ملاحظہ ہو:

'کچھ اختلاف نظر نے بھی دل دکھایا تھا، کچھ اضطراب کا
باعث بنا سلوک اس کا، خیال دل میں تو آیا کہ چھوڑ جاؤں یہ
در، یہ آرزو بھی نہیں تھی کہ روک لے وہ مجھے، سوال یہ تھا کہ
دہلیز کیسے پار کروں، ہزار مسئلے گھیرے ہوئے تھے گھر میں
اسے، .... وہ احتساب کے گرداب میں اکیلا تھا، اسی
لیے تو قدم اٹھ نہیں سکے شاید، میں جانتی تھی کہ اسے مری
ضرورت ہے!!'

اس تصور کے ساتھ ہندوستانی خاتون گھر کو توڑنے کے بجائے اسے خوشحال بنانے کی چاہ میں ہمیشہ کوشاں رہتی ہے۔ اس صورت میں وہ مرد اور عورت دونوں کی ذات کے تشخص اور دونوں میں حقوق نسواں کے تئیں شعوری بیداری پیدا کرنا چاہتی ہے۔ مغرب میں بن بیاہی ماؤں کے مسائل موجود ہیں جب کہ ہمارے یہاں اس کا تصور ممکن نہیں۔ ہر عورت ماں بننے سے پہلے شادی جیسے پاک جذبے کی خواہش مند رہتی ہے۔ طلاق یا بیوگی کی حالت میں اس عورت اور بچوں کی کفالت کی ذمہ داری مغرب کی طرح ریاستی

نہیں بلکہ معاشرتی ہے۔ بیوگی کی حالت میں خاندان یا برادری کے لوگ اور طلاق کی حالت میں شوہر اس عورت کی کفالت کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔

ہندوستان کے آئین کے مطابق عورتوں کا درجہ بحیثیت انسان مردوں کے مساوی ہے وہ آزاد شہری کے حقوق رکھتی ہیں۔ عورتوں کے لیے کئی قوانین بھی موجود ہیں جوان کو حق تلفی سے بچانے اور ان کی دفاع کے لیے بنائے گئے ہیں مگر عملی اعتبار سے خواتین اس سے بہت کم مستفید ہو پاتی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی جہالت ہے اور دوسری وجہ ہر معاملے میں گھر کے مردوں پر انحصار کرتا ہے۔ یہاں تک بھی دیکھا جاتا ہے کہ ووٹ ڈالنے سے پہلے انہیں پتہ نہیں رہتا ہے کہ وہ کس کا اور کیوں انتخاب کریں۔ یہاں بھی وہ گھر کے مرد پر ہی منحصر رہتی ہیں۔ اس لیے ہندوستانی تانیثی تصور کے علمبردار سب سے پہلے عورت میں ہی اپنے حقوق کے تئیں بیداری پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ انگریزی کی پروفیسر اور ناول نگار منجو کپور لکھتی ہیں:

"A women should be aware, selfcontrol, strong will, self reliant and rational, having faith in the inner strength of womenhood. A meaningful change can be deeper psychic sense."

(Manju Kapur, 'A married women', penguin pub, New Delhi, 2002, p-23)

عورتوں کی گھریلو مشقت جسے کام کے زمرے میں شمولیت نہیں ملتی پوری دنیا میں تانیثی تحریک کے پیش نظر رہا ہے۔ ہندوستانی عورت اپنے اس کام کا معاوضہ تو نہیں مانگتی مگر یہ چاہتی ہے کہ اس کے اس کام کی قدر کی جائے۔ چوں کہ اس کے اس گھریلو کام کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اس لیے وہ بھی گھر سے باہر نکل کر مردوں کی طرح مختلف شعبوں میں کام کرنے کی بھی خواہاں نظر آتی ہے۔ ہندوستان کے دیہی علاقوں میں ایسی بھی خواتین موجود ہیں جو گھر اور کھیتوں میں بلا معاوضہ محنت و مشقت کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ تعلیم سے محروم ان خواتین کی اکثریت اپنے حقوق سے آگاہ نہیں ہے۔ ان کی محنت سے جو بھی آمدنی ہوتی ہے زیادہ تر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اس کی شکل تک بھی دیکھنے سے محروم رہتی ہیں۔ اس پر صرف مرد کا حق ہوتا ہے۔ مگر یہ خواتین ان بنیادی انسانی مطالبات کی ضرورت شدت سے محسوس کرتی ہیں جو بحیثیت انسان ان کی محنت کا اجر اور ان کی کمائی پر انہیں آزادانہ تصرف کا اختیار دے سکیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

ظلمتوں کے دشت میں اب کس لیے بھٹکا کروں
مجھ کو میرے خضر نے وہ راہ دکھلائی نہ پوچھ
(رخسانہ جبیں)

موجودہ دور میں لڑکیوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔ وہ اپنی ماؤں سے زیادہ تعلیم حاصل کر رہی ہیں مگر زیادہ تر یہی دیکھا جاتا ہے کہ خاندان کی ترقی لڑکوں کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔ A.S. Altekar کے مطابق:

"In ancient times an all patriarchal soceities the birth of a girl was generally an unwelcome event. Almost everywhere the son was valued more than the daughter. He was a permanent economc asset of the family.He lived with his aged parents and didnot like the daughter to another family after the marriage. He perpetuated the name of his father's family."

(A.S. Altekar,The position of women in Hindu civilization: from prehistoric times to the present day, p-3)

آلٹیکر کا مذکورہ بیان قدیم ہندوستان کے تناظر میں ہے مگر آج بھی ہندوستان میں زیادہ تر ایسے گھرانے موجود ہیں جو لڑکیوں سے زیادہ لڑکوں کی پیدائش اور ان کی تعلیم کو ترجیح دیتے ہیں۔ بنیادی وجہ وہی ہے جو آلٹیکر نے بیان کیا مگر ہندوستان کی تعلیم یافتہ عورت اپنے علم و ہنر کی قدر و قیمت چاہتی ہے۔ اپنی ذات کے تئیں اپنے والدین کی توجہ اور محبت و شفقت کی متقاضی ہے۔ پیدائش سے پہلے ہی جبر اماں کی کوکھ میں اسے ختم کر دیا جاتا ہے اس لیے یہاں کی عورت اسقاط حمل میں اپنا اختیار چاہتی ہے۔

عورتوں پر ہو رہے گھریلو تشدد کی خبریں آئے دن سننے میں آتی ہیں جس کا شکار نچلے اور غریب طبقے کی عورت ہی نہیں بلکہ اوسط اونچے اور امیر گھرانوں کی عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورتوں کو اپنی جان تک گنوانی پڑتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہو:

ایک چھوٹی سی چھت کی خاطر کیا کیا خواب گنوا بیٹھی تھی
بھول گئی کہ اینٹیں اس کی مٹی گارے اس کے تھے

زنجیروں کے بدلے اب بھی گھنگھرو پائل بجتے ہیں
صدیوں سے یہ جبر کے بندھن بیچ ہمارے اس کے تھے

(کہکشاں تبسم)

اس آگہی کے ساتھ ہندوستانی عورت گھر میں برابری کا درجہ چاہتی ہے۔ مردوں کے ظلم و جبر سے آزادی کی طلب گار ہے۔ اپنی ذات کی شناخت کے لیے آزاد ملک کی آزادی کے ثمرات سے بہرہ ور عورت آئے دن نئے نئے مسائل سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔ گھر تک محدود تھی تو گھریلو مسائل کا سامنا تھا اور گھر سے باہر نکلی تو اس طرف بھی مسائل کا انبار اس کا استقبال کر رہا ہوتا ہے۔ یہ آج کی عورت کا کرب ہے کہ بیک وقت اسے دوہری زندگی گزارنی پڑ رہی ہے۔ ایک طرف دوہری ذمہ داری کے بوجھ سے پریشان ہے تو دوسری طرف ہر ہر قدم پر عزت کے تشخص کا مسئلہ درپیش نظر آتا ہے۔ آج کی عورت ایک ایسے معاشرے کا تقاضا کرتی ہے جہاں مرد کی طرح عورت بھی بلا خوف و خطر کہیں بھی آ جا سکے۔ مردوں کی شہوت بھری نگاہوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ دیگر پریشانیوں کے ساتھ ساتھ عزت کے تحفظ کی فکر دامن گیر نہ رہے۔ ایسی حالت میں آج کی خاتون اس جذبے سے معمور نظر آتی ہے:

بدل دیں گے ذرا سا وقت کو بس
ادھر کا کچھ اُدھر کرنا پڑے گا

(مسرت انجم)

ہندوستان میں چونکہ مختلف مذاہب سے جڑے ہوئے لوگ رہتے ہیں جو مذہبی اعتبار سے مختلف قاعدے و قوانین کی پیروی کرتے ہیں۔ ہندو مذہب میں مختلف ورنوں کا رواج ہے جہاں سب سے چھوٹا طبقہ شودر کہلاتا ہے جن میں دلت طبقہ بھی شامل ہے۔ اس طبقے کی عورتیں دو طرح کے مسائل سے دوچار ہوتی ہیں۔ ایک تو شودر کے لحاظ سے مرد کے ساتھ ساتھ ان کا بھی مختلف طرح سے استحصال کیا جاتا ہے اور دوسرا ایک عورت ہونے کے ناطے مختلف طرح کے مسائل کا سامنا کرتی ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں میں بھی ہندوستانی تہذیب کے اثرات کی بنسبت مختلف علاقوں میں عورت نسلی امتیازات کا شکار رہتی ہے۔ اس لیے ہندوستان میں بھی اس تصور کے حامی "The personal is the political" یعنی "نجی ہی سیاسی" کے نعرے کی تائید کرتے ہیں۔ کیوں کہ جس کسی بھی گھر میں عورت تشدد کا شکار ہے چاہے وہ کسی بھی مذہب یا طبقے سے کیوں نہ تعلق رکھتی ہو تو یہ گھریلو یا نجی معاملہ نہیں ہے بلکہ عوامی معاملہ ہے۔ اگر کسی بھی لڑکی کی شادی جہیز دے کر کی جائے تو یہ ان کا نجی معاملہ نہیں ہے اس سے پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے ہندوستانی عورت بھی گھر اور معاشرے میں نیچے سے اوپر تک ہر طرح کے تشدد کا خاتمہ چاہتی ہے۔ اس لیے فیمنسٹ "Universal Sisterhood" کی بات کرتے ہیں۔

ہندوستان میں دورِ حاضر میں کھل عام نہ سہی مگر پوشیدہ طور پر عورت عصمت فروشی کے بیوپار سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ اس کے پیچھے کئی وجوہات کارفرما نظر آتے ہیں۔ مگر عمومی طور پر غریبی، بے روزگاری اہم اسباب ہیں۔ اس لیے تانیثی نظریہ رکھنے والے مانتے ہیں کہ چونکہ ہندوستانی قانون سماج میں عورتوں کو برابری کا درجہ دیتا ہے تو سب سے پہلے سماج کو انہیں معاشی، سماجی اور نفسیاتی تحفظ کی ضمانت دینی ہوگی اور حکومت سے یہ مانگ کرتے ہیں کہ عورتوں کو اس پیشے سے نجات دلانے کے لیے ان کی معاشی بحالی کا انتظام کیا جائے۔

جہاں تک ادب کی بات آتی ہے یہاں بھی مردوں کی اجارہ داری موجود تھی۔ مغربی خاتون کی طرح ہندوستانی خاتون اس عصبیت کو دور کرنا چاہتی ہے۔ ایک وہ دور تھا جب خواتین اپنے احساسات و جذبات کو الفاظ کے موتیوں سے پرونے کے لیے بے چین و بے قرار تھیں مگر ان کی تحریری صلاحیتوں کو لائق اظہار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ادیبائیں اپنا نام بدل کر اپنی تخلیقات کو منظرِ عام پر لاتی تھیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

میں درد جاگتی ہوں، زخم زخم سوتی ہوں
نہنگ جس کو نگل جائے ایسا موتی ہوں
وہ میری فکر کے روزن پہ کیل جڑتا ہے
میں آگہی کے تجسس میں خون روتی ہیں

(ترنم ریاض)

اور آج کا دور ہے جہاں انہوں نے ادب میں بھی اپنی صلاحیتوں کو منوایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ماضی میں مردوں کے ذریعہ تخلیق کردہ ادب جس میں انہوں نے عورت کو اسی طرح پیش کیا جس طرح انہیں رکھا گیا تھا، انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اسے کیسا ہونا چاہیے یا اس روایتی ڈھانچے سے الگ اور کیسی ہو سکتی ہے؟ اس لیے متون میں عورت کردار کا ازسرِنو مطالعہ عورت کے نظریے سے کیا جانا چاہیے۔ اس لیے مرد تخلیق کاروں کے ذریعہ پیش کی گئی عورت کی شبیہ کو فیمنسٹ ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ انہوں نے عورت کو جس طرح دکھایا ہے وہ کسی بھی پہلو سے قریب از قیاس نہیں ہے۔ ان تخلیقات میں جس روایتی Stereotype عورت کو پیش کیا گیا ہے اس کے مطالعے سے قاری کبھی بھی یہ نہیں جان پائے گا کہ عورت کے اندر بھی

سوچنے سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے جیسا مرد اسے دکھا رہا ہے وہ ویسی ہی ہے یا ویسی بنادی گئی ہے۔

گزشتہ دو صدیوں میں فیمنزم کی تحریک نے عورتوں کے لیے تعلیم اور ملازمت کے مساوی مواقع، جائیداد کی ملکیت کا موقع، ووٹ دینے کا حق، پارلیمنٹ میں نمائندگی کا موقع، برتھ کنٹرول، شادی اور طلاق وغیرہ کے حق کے حصول میں خاطر خواہ کام انجام دیا ہے۔ جو ہندوستانی عورت کے جد وجہد کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ مگر کہیں کہیں یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ مغربی خواتین کی نقالی میں آج کی جدید ہندوستانی عورت اس تحریک کے بنیادی مقاصد کو بھلا کر بے راہ روی کا شکار ہو گئی ہے۔ مردوں سے جنگ یا اپنے حیاتیاتی نظام کے خلاف جاکر ان کی طرح بن جانا یا صدیوں سے ہو رہے ظلم و جبر کا بدلہ مردوں سے لینا، ان کو ان کے حقوق سے دور کر دینا، قدرت کے ذریعہ رائج کیے گیے سہولیات سے انھیں محروم کر دینا، زندگی کے ہر میدان میں انھیں کمتر اور خود کو برتر دکھانا وغیرہ اس تحریک کے مقاصد نہیں ہیں۔ مگر آج مساوات مرد و زن کے متعلق جدید عورت کا نظریہ کہیں نہ کہیں انھیں سارے عناصر سے جڑ چکا ہے۔ عورت نے اپنے بدلے کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے فطری روش کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور مصنوعی طریقے کو اپنا لیا ہے، جس کی بدولت خاندانی نظام منتشر ہو رہا ہے، بچے اپنے والدین کی محبت سے محروم ہو رہے ہیں، نوجوان پیڑھی جنسی بے راہ روی کا شکار ہو رہی ہے، مجرد رہ کر ہم جنس پرستی جیسے لعنت کو اپنایا جا رہا ہے، تولید کے فطری طریقے کو چھوڑ کر مشنوعی طریقوں کو اپنایا جا رہا ہے۔ شادی شدہ زندگیاں ابدی خوشیوں سے محروم ہو رہی ہیں جس کی وجہ سے معاشرے میں طلاق کی کثرت دیکھنے کو مل رہی ہے۔ عورتیں اپنی ایسی ہی ناجائز مطالبات کو پورا کرنے کی دھن میں عقل سے عاری ہو چکی ہیں۔ انھیں احساس بھی نہیں ہے کہ کل ان کا استحصال گھر کے اندر ہو رہا تھا اور آج گھر کے باہر ہو رہا ہے۔ یہ آزادی نہیں ہے سراب کا سا دھوکہ ہے جو اس کے ارد گرد دبیز دھوئیں کی شکل میں گھیرا بنائے ہوئے ہے جس کے اس پار اسے کچھ نہیں دکھ رہا۔

ایسے کئی ایک تصورات موجود ہیں جو ہندوستانی عورت کے تانیثی شعور کے ضامن ہیں جن کا احاطہ ایک چھوٹے سے مضمون میں کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ المختصر یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی عورت کا تانیثی شعور بیدار بھی ہے اور متحرک بھی۔ ایک خوشحال زندگی کے لیے اپنے بنیادی حقوق کا شعور اور بحیثیت انسان سماج میں برابری کے درجے کی معلومات سے وہ نہ صرف آگاہ ہے بلکہ اس کا مطالبہ بھی کرتی ہے۔ دیہی علاقے کی ان پڑھ عورت فیمنزم یا تانیثیت کے لفظ سے نامانوس ہو سکتی ہے مگر اپنے حقوق کے تئیں بے داری کا جذبہ اس کے اندر بھی موجزن نظر آتا ہے۔ اس لیے عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ایسی عورتیں بھی معاشرے کے خلاف جاکر اپنی بیٹیوں کو تعلیم دلانے میں کوشاں نظر آتی ہیں کہ آگے چل کر ان کی بیٹیاں ان کی طرح زندگی نہ گزاریں۔ یہاں یہ عورتیں بھی فیمنزم سے ناواقفیت کے باوجود فیمنسٹ کہلائی جائیں گی۔ بیس سال پہلے ساؤتھ ایشیا کی چند روشن خیال خواتین کے ذریعہ حقوق نسواں کے علمبرداروں کے لئے پیش کیا گیا تعارف ایک فیمنسٹ کی شخصیت کی بہترین عکاسی کر رہا ہے:

"Anyone who recognizes discrimination against women and girls, within the family, at the place of work and in society in general, and who takes action against this discrimination is a feminist."

آج ہندوستانی عورت ایک ایسے دن کی صبح کا انتظار کر رہی ہے جب آزادی، تحفظ اور برابری کے حق سے مرد کی طرح عورت بھی مکمل طور سے بہرہ ور ہو۔ میں اپنے اس مقالے کو ادا جعفری کی نظم ' سانجھ سویرے ' کے ان اشعار پر ختم کرنا چاہتی ہوں جن میں ایسی ہی روشن صبح کا ذکر کیا گیا ہے:

بھیگی بھیگی پلکوں والی
جلتی آنکھیں ہیں میری ہیں
دکھ کی فصلیں کاٹنے والے
جلتے ہاتھ ہیں میرے ہیں
شاخ سے ٹوٹی کچی کلیاں
آگ میں جھلسے کومل مکھڑے
ابھی ابھی لٹ بھی میری
دھجی دھجی آنچل بھی
کالی رات کی چادر اوڑھے
اجلے دن کا رستہ دیکھ رہی ہوں

□□□

Shazia Tamkeen
C/o. Dr. Shahnawaz Alam
156-Wasiabad, Noorullah Road
Allahabad-21100

قمر النساء

صغریٰ عالم کی شاعری
"صف ریحاں" کے آئینہ میں

ڈاکٹر صغریٰ عالم کا شمار برصغیر کی نمائندہ شاعرات میں ہوتا ہے انکا تعلق سرزمین بندہ نواز گیسودراز سے ہے 18 فروری 1938 میں ایک علمی وادبی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ گھر کی ادبی فضا نے انکی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشی ۔ پیشہ تدریس سے وابستہ تھیں جہاں وہ ایک کامیاب شاعرہ اور نثر نگار ہیں وہیں بہترین استاد بھی۔ ان کے پیش نظر طالب علموں کی تعلیم ہی نہیں تربیت بھی تھی اور وہ طلبا کی تربیت کے ساتھ ساتھ انہیں جینے کا ڈھنگ اور سلیقہ بھی سکھاتی تھیں۔

بقول صغریٰ عالم:

ہر ایک صبح کو وہ مکتب کے نام کرتی تھی
ردا ورق کی تھی قوس وقزح کے رنگوں میں
قدم اٹھاتی تھی مکتب کی جائے احسن تک
سبق وہ پڑھتی تھی ممتا کی آیتوں کی طرح

انھوں نے اپنے تخلیقی اظہار سے ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام بنایا اور انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بھی شاعری سے کیا۔

صغریٰ عالم اپنی شاعری سے متعلق رقمطراز ہیں۔

'مجھے اس شاعری پر یقین ہے جو زندگی سے پیار کرنا سکھاتی ہو ، جو جمالیاتی احساس کو روشن کرنے کے علاوہ سماج کے خزاں آشنا جسم کو موسم بہار کا لباس فاخرہ پہناتی ہے۔ قومی یکجہتی ،حقوق نسواں ،زندگی کے تلخ وشیریں تجربات کا اظہار حیات کے قریبی موضوعات سے معیاری شاعری عبارت ہے۔'

ان کی شاعری میں بھی تدریس اور تربیت کے نمونے مل جاتے ہیں جو ثابت کرتے ہیں وہ ایک بہترین اور بے مثال شاعرہ تھیں۔

تاحال ان کی گیارہ کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں جن میں سات شعری مجموعے

1) حیلۂ صدف 1990
2) بیت الحروف 1995
3) صفِ ریحاں 1977
4) محرابِ دعا (حمد ونعت) 1999
5) قوس وقزح 2004
6) حنا غزل 2005
7) نشاطِ معنی 2007

ان کے علاوہ نثری مجموعے

☆ کفِ میزاں (تبصرے) 2004
☆ نامے جو میرے نام آئے (خطوط) 2004
☆ ابر نیساں (مصنفہ کی کتابوں پر لکھے گئے تبصرے) 2006

میزان عروض (عروضیات) اور ردائے سخن (شعری مجموعہ)۔ زیرِ ترتیب

صف ریحاں صغریٰ عالم کے تخلیقی اظہار کی تیسری کڑی ہے جس میں سب سے پہلے کشتِ ریحاں کے عنوان سے مصنفہ کا مقدمہ ہے روش نامی عنوان میں 53 غزلیں ،4 دوہے اور 7 مختلف عنوانات پر نظمیں ہیں صغریٰ عالم کی شاعری ہوا کے تازہ جھونکے کی طرح ادب کے قارئین کو فرحت اور سرشاری کا احساس کراتی ہیں۔ زیرِ نظر تصنیف میں انہوں نے "کشتِ ریحاں" کے تحت اپنی شاعری پر بہت ہی شاعرانہ اور دلنشین اسلوب میں مقدمہ لکھا ہے:

'مسیحائی کی بوندیں دل میں جذب ہوئیں، آسمان سے نور اور

سنہری خوابوں میں تعبیریں اترنے لگیں تو میں نے صفِ ریحاں کا اہتمام کیا۔" (صفِ ریحاں ص 8)

صغریٰ عالم برصغیر کی ایک ایسی شاعرہ ہیں جو اپنی تخلیقی سوچ کو شعر بنانے کے عمل میں بہت ہی دلنشین اسلوب اختیار کرتی ہیں حمد یہ کلام ہو کہ نعتیہ کلام ہو ،غزلیں ہو کہ نظمیں ہو۔وہ بغیر کسی تصنع کے اپنے مشاہدے ،مطالعے اور محسوسات کو اپنی شاعری میں سمو لیتی ہیں ۔ انہوں نے اپنے ہر مجموعے کلام کی ابتدا حمد اور نعت سے کی ہے حمد یہ اور نعتیہ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

حمد کے اشعار:

صدائے کن سے ابد تک شباب تیرا ہے
عیاں بھی تو ہے پنہاں حجاب تیرا ہے
کسی بھی در سے اجالوں کی بھیک کیا مانگیں
اندھیری شب بھی تیری آفتاب تیرا ہے

شاعر جب رسول کے پاکیزہ سمندر میں ڈوب کر اپنے جذبات کو شعر کے قالب میں ڈھالتا ہے تو وہ الفاظ نعت کی شکل میں روح سے نکلتے ہیں خدا کی خوشنودی و معرفت عشقِ رسول پر موقوف ہے اور صغریٰ عالم کو حضور سرورِ کائنات سے بے پناہ محبت تھی اسکا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے۔

نعتیہ اشعار:

میرے سرکار کی توصیف میں دفتر لکھتا
صاحبِ لوح وقلم علم کے مرکز لکھتا
خاک بطحا میں مرے تن کو ملا کر لکھتا
میری تقدیر محمد کو ثنا کر لکھتا

کہا جاتا ہے کہ انہیں ایک خواہش تھی کہ وہ اپنے نام کے ساتھ بھی محمد سابقے یا لاحقے کے طور پر استعمال کریں جو کہ اکثر مردوں کے نام کے ساتھ لگایا جاتا ہے اور ان کی خواہش حقیقی زندگی میں تو پوری نہ ہو سکی مگر شاعری میں انہوں نے اس حسرت کو مسرت میں بدل لیا۔

مجھ کو حاصل ہوں مدینے کے اجالے یا رب
اک مرا نام بھی اب کے سرِ محضر لکھتا
میں نہ لکھ پاؤں گی توصیفِ محمد صغریٰ
اتنا آسان نہیں توصیفِ پیمبر لکھنا

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں حضور سرورِ کائنات سے کتنا عشق تھا اور ان کی دلی وابستگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

ان کی شاعری میں جہاں ایک طرف زندگی کی رعنائی اور دلکشی ہے تو دوسری طرف زندگی کی تلخیوں کی روش بھی ہے۔زندگی کے نشیب و فراز کو انہوں نے اپنی شاعری کا اہم موضوع بنایا ہے جہاں سکھ اور دکھ ،خوشی اور غم ،حسرت و یاس ،محبت اور نفرت جیسے احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے حنا غزل کے پیش لفظ "سرخ رو" میں لکھتی ہیں ۔

"سچ تو یہ ہے کہ پیار درد اور احساس کے عکس کو جذب کرنے کی تمنا ہو جائے تو دل و دماغ میں ایک شعور پھیل جاتا ہے اور زبان سے شعور کی بوندیں گرنے لگتی ہیں یہی شعور شعر سے لہجے کی صداقت بن جاتا ہے۔" (حنا غزل ص 2)

اور عشق شعور کی کار فرمائی ہے شاعری کا مرکز ہی عشق ہے اور عشق سے ہی درد و کرب ،فکر و خیال ،ہجر و وصال کو جلا ملتی ہے ۔اور یہ عشق کبھی حقیقی تو کبھی مجازی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔صغریٰ عالم کے یہاں ان ہی حقیقی اور مجازی تصوروں کی دنیا آباد ہے۔

ہمارے درد نے معنوں سے لذتیں لے کر
ہر ایک لفظ کے پہلو میں شاعری کی ہے
یہ عشق پیار محبت وفا جنوں صغریٰ
کوئی یہ دل کا اثاثہ مزید لائے مجھے

اکثر و بیشتر ان فنکاروں کے فن میں ہمیں ہماری زندگی کا ترجمان دکھائی دیتا ہے۔صغریٰ عالم نے بھی زندگی میں درپیش مسائل کرب و مسرت اور جن حالات سے ہم نبرد آزما ہوتے ہیں اپنے فن میں قید کر لیا ہے اور ان کے تجربات و مشاہدات ہمارے خیالات کا عکس بن جاتے ہیں۔

اک کاشت گلابوں کی ہے ریشم کی ہیں فصلیں
خوش باش ہوا دن اور خوش رات ہوئی ہے
میں نے پائی ہی نہیں ہجر کے لمحوں کی سزا
میرا محبوب مجھے اپنی کتابوں میں ملا
غم اور خوشی کا ایک صحیفہ ہو ہاتھ میں
ہر اک ورق کو رشتہ وابستگی ملے

غرض صفِ ریحاں زندگی کے نشیب و فراز اور دلکشی و تلخی دونوں کا حسین سنگم ہے خود صغریٰ عالم "کشتِ ریحاں" میں رقم طراز ہیں۔

"صفِ ریحاں میں کوئی اندیشہ سود و زیاں نہیں ہے صرف سچ کی نمود ہے ،جس سچ کو دل مانے اور جو روح میں سرایت کر جائے۔۔۔۔رنج و الم کے برگِ آوارہ ہوا کے دوش پر

اڑتے رہے اور عطر یہاں بجتی رہی جسمیں فطرت کی دھوپ چھاؤں، حالات کی نرمی گرمی موجود ہے، خواب کی روشنیاں بھی ہیں، رنجشوں کے احساسات بھی ہیں، خیالات کا اظہار بھی ہے، رازہائے سربستہ کی سرگوشیاں بھی سنائی دیتی ہیں نسیم صبح ہے اور شبنم کی التفات بھی ہیں، کچھ کھو کر پانے اور پا کر کھونے کی تقدیریں بھی ہیں۔(صفِ ریحاں ص3)

اس اقتباس پر یہ اشعار صادق آتے ہیں۔

کبھی خوشی بھی نبھائی غموں کو خوش بھی کیا
ہزار رنگ لٹا کر یہ زندگی کی ہے
ہمارے درد نے معنوں سے لذتیں لے کر
ہر ایک لفظ کے پہلو میں شاعری کی ہے

ان کی شاعری زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرتی ہے انکی شاعری میں عشقِ حقیقی بھی ہے اور عشقِ مجازی بھی، قومی یکجہتی بھی ہے اور حب الوطنی بھی۔ اور وہ وطن کے حالات پر بھی بے لاگ تبصرہ کرتی ہیں۔

وہ ہو چکا تھا وطن سے غافل وہ زر پرستوں کے کام آیا
جسے نہ تھی کچھ وطن کی قیمت اسی کے ہاتھوں نظام آیا

جہاں ان کی شاعری شگفتہ لب ولہجہ لئے ہوئے ہے وہیں طنز کی کاری ضرب بھی ہے اور حالاتِ حاضرہ پر بھی بہترین اشعار موجود ہیں اشعار دیکھئے۔

رنگِ گل، جس کو خزاں نے بھی دمکتا دیکھا
آج اس گل کو بہاروں نے مسلتا دیکھا
کون کہتی ہے کہ مقتل کا گماں ہوتا ہے
خون ہی خون جبینوں سے ٹپکتا دیکھا
اپنے ہاتھوں میں لئے مشعلِ جبر وستم
حاکمِ دیر و حرم کو بھی گزرتا دیکھا

زیرِ نظر تصنیف کی نہ صرف غزلیں بلکہ نظمیں بھی قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہیں مختلف عنوانات کے تحت نظمیں لکھی گئی ہیں مدر ٹریسا کے سانحہ ارتحال کے موقعے پر شاعرہ نے ایک بہت ہی پرسوز نظم لکھی ہے نظم کا عنوان ہے "مادرِ مخلوق غم آسا مدر ٹریسا" کے اشعار ملاحظہ فرمائے۔

زمیں خلد سے رخصت ہوئی مادر
بشر زادی
فرشتہ خصلتوں والی
مسیحا دردمندوں کی
دریدہ جسم کا مرہم
بلکتی روح کی تسکین
معالج درد پیہم کی
صحیفہ دل کی آیت کا
صداقت نیک راہوں کی
عمل پیکر، مفسر دردمندوں کی
عنایت آئینہ فیصل
وفا ثابت نظر اونچی
مقدس بندگی والی
دعا والی

فنا کے بعد بھی ہوگی بقا اس کی
ہمیشہ یاد کی صورت
نہ کوئی دوسرا ہوگا
مماثل مادرِ مخلوق جیسا بھی

اس قسم کے جذبات عورت ہی کا خاصہ ہے جسمیں شدت محبت اور ممتا ملی جلی ہے ان اشعار کو پڑھنے سے انکے جذبات واحساسات کی پاکیزگی کا اندازہ ہوتا ہے انہوں نے اپنی شاعری میں اکثر لفظ "صحیفہ" اپنی ماں کے لئے استعمال کیا ہے اور یہاں قوم مادر کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال انکی عقیدت کا ثبوت ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے مطالعے سے صغریٰ عالم کی فکری نہج بکھلا ذہن، جرأت مندی، حوصلہ مندانہ تفکر سامنے آتا ہے انکی جراءت مندی اور فکری نہج کو انکی شاعری میں جابجا محسوس کیا جاسکتا ہے

پروفیسر عنوان چشتی رقم طراز ہیں۔

"قسام ازل نے صغریٰ کو زبردست تخلیقی قوتوں سے بہرہ مند کیا ہے میں انکی تخلیقی قوت کا بے حد معترف و مداح ہوں۔۔۔۔۔ انکی تحریروں میں جو حسن اور زندگی ہے جو تخلیقی شان ہے وہ انشاءاللہ اپنے لئے خود راستہ بنالے گی بالکل پہاڑی ندی کی طرح جو چھل بھل کرتی ہر بلند و پست سے اپنا راستہ بنا کر نکل جاتی ہے۔"(صفِ ریحاں ص4)

صغریٰ عالم ایک منفرد لب ولہجہ کی شاعرہ ہیں وہ کسی مخصوص نظریہ کی حامل نہیں تھیں نہ ہی انکی شاعری کو کسی ادبی منشور سے وابستہ کیا جاسکتا ہے ان کی شاعری میں اس عہد کا عکس ضرور دیکھا جاسکتا ہے۔

دل دہل جائے گا اور روح تڑپ اٹھے گی
اب اذانوں کی صدا بن کے ابھرنا ہوگا
ناخدا اپنے سفینے کا بھرم رکھ لینا
آگ دریا کا ہے اس پار اترنا ہوگا

احمد جلیس ان کی شاعری کے بارے میں فرماتے ہیں:
'صغریٰ عالم حیدرآباد کرناٹک کی واحد شاعرہ ہیں ان کی شاعری اہل گلبرگہ کے لئے ایک انمول تحفہ ہے محترمہ کی تخلیق سرزمین بندہ سے اٹھی ہے جو پھولوں میں تولنے کے قابل ہے۔'

صفِ ریحاں میں شامل غزلوں نظموں میں بھلے ہی کوئی فلسفہ زندگی نہ ہو زندگی ضرور ہے ایسی زندگی جو دہائیوں کے مطالعے ،مشاہدے اور تجربات کا نچوڑ ہے۔

نہ تخت و تاج نہ لباس تھا اپنا
محبتوں کے قبیلے کی سروری کی ہے

ان کے اشعار میں جہاں زبان وبیان کی سادگی ہے وہیں دوسری طرف خیال کی صداقت متاثر کن ہے شاعری کے لئے شاعر میں جمالیاتی حسن ہونا بہت ضروری ہے صغریٰ عالم ایک ایسی شاعرہ ہیں جنکے پاس لفظی جمالیات کا خزینہ ہے دراصل یہی لفظی جمالیات انکا شعری اسلوب ہے وہ تراکیب اور بندش الفاظ کا استعمال بہت ہی فنی چابکدستی سے کرتی ہیں جس سے انکی شاعری جگمگا اٹھی ہے جیسے صفِ ریحاں، حنائیدست، صحیفۂ جان، عود وعنبر، دستِ نارسا، بیت الصواد، دست یارانِ وفا، نسخۂ زیست، ابر نیساں اور قفل ابجد وغیرہ ان لفظیاتی ستاروں سے انکی کہکشاں شاعری سج اٹھی ہے۔

چشم نم ابر نیساں میں صدف دل ملا
جوہری کو پرکھنے کی فرصت بھی ہو
خود اپنے پاس ہی رکھنا کئی ایک عرضیاں بھر کر
نہیں کھلتے یہ سارے قفلِ ابجد کنجیاں بھر کر

شاید اسی لئے ان کی شاعری قاری کے ذہن ودل میں براہ راست اتر جاتی ہے انکی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے جہاں وہ الفاظ کے ساتھ کھیلتی نظر آتی ہیں اور ان الفاظ سے اپنے تخیلات کو حقیقی جامہ پہناتی نظر آتی ہیں۔

تمام راتیں بچھائیں یہاں صفِ ریحاں
تصورات میں یادوں کو پر بہار کریں

■ ■ ■

Qamarunnisa
Research Scholar
Dept. of Urdu & Persian
Gulbarga University
Gulbarga-585106(Karnatak)

فرہنگ آصفیہ

اَکّڑ بکّڑ ۔ ہ۔ اسم مذ کر۔ (ایک کھیل ہے جو چھوٹے چھوٹے بچے اس طرح کھیلتے ہیں کہ کئی بچے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں کھڑی کر کے زمین پر ٹکا دیتے ہیں۔ ایک بچہ الفاظ ذیل کہتا جاتا اور ہر ایک ہاتھوں پر کلمے کی انگلی باری باری سے رکھتا جاتا ہے جس بچے کے جس ہاتھ پر وہ عبارت تمام ہوتی ہے اس سے پوچھتا ہے کہ ''کھنڈا (کھانڈا) ماروں یا چھری؟'' اگر اس نے کھنڈا کہا تو یہ کہے گا ''تیری ماں کا پیٹ ٹھنڈا'' اول تو چھری کوئی کہتا نہیں اور جو کسی نے کہا تو یہ کہے گا۔ ''تیری ماں لوری'' ۔وہ عبارت یہ ہے۔

اکّڑ بکّڑ دہی چٹیکن۔ اکلا جھولے بکلا جھولے۔ ساون ماس کریلا۔ پھولے پھولے پھول کی بالیاں۔ بادا گئے گنگا لائے ساتھ پیالیاں۔ ایک پیالی پھوٹ گئی۔ نیولے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ کھنڈا ماروں یا چھری؟) جس جس کے ہاتھ پر یہ عبارت ختم ہوتی جاتی ہے اس کے ہاتھ اٹھا اٹھا کر سینہ پر رکھتا جاتا ہے جب سب کے ہاتھ رکھوا چکتا ہے تو سب مل کر جھوٹ موٹ کی چکی پیستے اور کہتے جاتے ہیں۔ چکی گھمر گھمر اس کے بعد ہاتھوں کی چھلنی بنا کر آٹا چھانتے اور یوں زبان پر لاتے ہیں۔ کہ آٹا یاں رکھو۔ بھوسی یاں رکھو جب آٹا چھانتے ہیں تو بھوسی کا فرضی رو وصہ بدلوا کر جھوٹ موٹ کی کھیر پکاتے اور آپس میں بانٹ کر کھاتے ہیں۔ تقسیم کی حالت میں بعض لڑکے کو چھوڑ دیتے ہیں وہ شکایت کرتا ہے تو جواب میں کہتے ہیں تمہارا حصہ رکھا تھا۔ کتا پادا گیا۔ بلی سونگھ گئی۔ یعنی اپنے ہاتھ چاٹو اور اسی کو کھیر سمجھو۔

نوربینہ پروین

اقبال اور قرۃ العین حیدر کے فکری رجحان کی مماثلت

اقبال اور قرۃ العین حیدر اردو ادب کے دو ایسے مایہ ناز ادیب ہیں ۔انھوں نے اپنی تخلیقی کاوشوں سے پورے وسطی ایشیا کی سیاسی، تاریخی اور تہذیبی زوال کی نمائندگی اپنی تخلیقات میں کر دی ہے۔دونوں نے اردو ادب کو محدود دائرے سے نکال کر وسیع کینوس میں ضم کر دیا ہے یہ دونوں ہی اپنی تخلیقات میں مشرقی روداد کی تصویر کشی کرتے ہیں لیکن اس کے اثرات بد سے خائف یا نالاں نہیں بلکہ ماضی کے کارناموں پر اقبال اور قرۃ العین دونوں ہی متفاخر نظر آتے ہیں اور اسے دوبارہ حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اگر چہ دونوں کی پرورش و پرداخت اور سماجی و معاشی حالات میں کافی فرق ہے لیکن دونوں کی بنیادی فکریں تقریباً ایک ہی سمت سے شروع ہوتی ہیں یہ الگ بات ہے کہ اقبال ملتِ اسلامیہ کی زوال آمادہ تاریخ کو ذہن نشین کراتے ہیں تو قرۃ العین حیدر مشرقی تہذیب کے کھوکھلے پن کو نمایاں کرتی ہیں۔کسی شاعر نے خوب ہی کہا ہے:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اقبال اور قرۃ العین کی تاریخ پیدائش میں کافی فرق ہے لیکن دونوں نے تقریباً انھیں حالات کا مشاہدہ کیا ہے۔اقبال کی تاریخ پیدائش 1876 تو قرۃ العین کی تاریخ پیدائش 1927 ہے۔اقبال کے والد نور محمد صوفی تھے اور بیٹے کی تربیت بھی اسی نہج پر کی۔لہٰذا اسلام کی معرفت و حقانیت اقبال کی روح میں حلول کر گئی تھی جس کے پیش نظر وہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو ایک متحد شکل میں دیکھنے کے متمنی تھے۔جبکہ قرۃ العین حیدر کے والد سجاد حیدر یلدرم انگریزوں کے زمانے کے ڈپٹی کلکٹر تھے بظاہر ان کی تربیت انگریزی طرز و انداز سے ہوئی جس کے اثرات قرۃ العین حیدر پر شدت سے حاوی نظر آتے ہیں لیکن وہ مشرقی بالخصوص ایرانی تہذیب کی بھی موئد تھیں گویا اسلام دونوں کی روح میں شامل تھا۔فرق صرف اتنا ہے کہ اقبال اس کی گہرائی میں ڈوب کر اسی رنگ آمیزی کی پوری طرح کارفرمائی پر کمربستہ ہیں تو قرۃ العین حیدر کے یہاں اسلام روایتی انداز میں ملتا ہے۔اقبال کو ان کے بڑے بھائی نے اپنی جائداد بیچ لندن تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا جبکہ قرۃ العین حیدر تا زندگی لندن کے سفر کرتی رہیں۔

اقبال نے اس دور میں آنکھیں کھولیں جبکہ ملک کی زبوں حالی اور انتشار و افراتفری کے ساتھ ہی انگریزوں کے جبر وآہنی نظام نے ہندوستان کے باشندوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔یہی نہیں پھر عالمی جنگ کا قہر بھی برداشت کرنا پڑا۔جس نے پوری دنیا میں سراسیمگی کی کیفیت پیدا کر دی اور چاروں طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔پہلی عالمی جنگ کے سرد پڑتے ہی اندرونی ملک میں آزادی کے مطالبے تیز تر ہونے لگے اور یہی وقت قرۃ العین حیدر کی پیدائش کا ہے۔اس دور میں بھی اندرون ملک میں انگریزوں کے آہنی اور جبری تفذ وا پہلی کی شکل میں موجود تھے بلکہ اب قید و بند کی سختیاں اور بڑھ گئی تھیں۔اس کے بعد جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو اس وقت تک قرۃ العین حیدر شعوری پختگی کی منزل میں قدم رکھ چکی تھیں حالانکہ انھوں نے 12 سال کی عمر سے ہی شروع کر دیا تھا۔اور ان ساری صورتِ حال کو کافی قریب سے دیکھا۔اس اعتبار سے دونوں کے تخلیقی مقاصد تقریباً ایک تھے۔ اقبال نے مغرب کی گھٹیا درجے کی

حرکات اور عرب و ماورائے عرب (مسلم ممالک) کی خستہ حالی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تخلیقی کام کو انجام دیا۔ اور اپنی تخلیقات کے ذریعے ملت اسلامیہ کو خواب غفلت سے بیدار کرنے، ماضی کے کارناموں اور معرکوں سے نصیحت حاصل کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی تلقین بڑے پر امید انداز سے کرتے رہے۔ قرۃ العین حیدر دوسری عالمی جنگ، ملک کی آزادی اور تقسیم ہند سے پھیلی آپسی منافرت اور فسادات کے برے نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے اپنے ماضی کے حالات پر متمکن ہونے کے خواب دیکھتی ہیں۔ ہندوستان میں مسلم حکومت بطور خاص مغل حکومت کے زوال اور مٹتے ہوئے نقوش میں ایرانی، تورانی اور ترکی کی تباہی کے نتائج میں ہونے والی تہذیبی زوال کی داستان اپنی تخلیقات میں بیان کرتی ہیں۔

اقبال و قرۃ العین حیدر میں ایک اہم مماثلت یہ ہے کہ دونوں ہی احساسِ برتری کے قائل ہیں جس کا اندازہ ان کی تخلیقات سے ہوتا ہے قرۃ العین حیدر اپنے خطوط کے مجموعے 'دامانِ باغباں' میں مشرقی ممالک ایران، ترکستان اور سمرقند و بخارا کے جاہ و حشم اور کی عظمتِ رفتہ کو فخریہ انداز سے بیان کر کے محظوظ ہوتی ہیں اور اپنے آباء و اجداد کا اور اپنے خاندان پر فخر کرتی ہیں۔ اسی لئے کسی نہ کسی انداز سے اس مٹتی ہوئی تہذیب کے نقوش اپنے ناول، افسانے، خطوط اور رپورتاژ وغیرہ میں پیش کرتی ہیں مشرقی تہذیب کی روایات محفل، مجلس، محرم و عزاداری کے ساتھ ہی مشرقی طرزِ معاشرت کی چیزیں اگلدان، پاندان، خاصدان، قالین اور غالیچے وغیرہ کا ذکر اکثر و بیشتر کرتی ہیں۔

اقبال بھی دورِ اسلام کے دورِ عروج پر نازاں ہیں اگرچہ ملتِ اسلامیہ کے زوال سے رنجیدہ و مغموم ضرور ہوتے ہیں لیکن افسوس و گریہ زاری کے بجائے ماضی کی عظمتوں اور کارناموں پر بخوبی رشک کرتے ہیں۔ انھیں گذشتہ یادوں کی ایک جھلک ''شکوہ'' سے ماخوذ ہے:

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

گویا دونوں کے یہاں احساسِ برتری کا وہی انداز غالب ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ایک مشرقی تہذیب پر تو دوسرا دورِ ماضی کے اسلام پر متفاخر ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ہندوستان سے ختم ہوتی ہوئی مغل حکومت اور انگریزوں کے ملک میں قبضہ ہونے کے ہمراہ مٹتی ہوئی مشرقی تہذیب کے نقوش کی تصویر کشی ''آگ کا دریا'' میں تفصیلی وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہیں تو ''گردشِ رنگِ چمن میں'' لکھنو کے نوابین اودھ کے مابین نیست و نابود ہوتی ہوئی مشرقی تہذیب کی کہانی موثر طریقے سے بیان کر دیتی ہیں اور اس کا ذمہ دار سماجی تغیرات کے عوض شروع ہونے والے اربابِ نشاط کو محصور کرتی ہیں۔ ''سفینہ غمِ دل'' اور ''چاندنی بیگم'' میں بھی اسی زوال کے واقعات کو چھوٹے چھوٹے فقرے اور جملے کے ذریعہ ادا کرتی ہیں۔ اقبال بھی اپنی شاعری کے ذریعہ مسلمانوں کی قدیم تاریخی عظمت و رفعت پرزور انداز سے کرتے ہیں کیونکہ مسلمانوں کی بے حسی اور غفلت شعاری کی ہی وجہ سے بیت المقدس جو مسلمانوں کا قبلۂ اولیٰ تھا آج عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا اور مغرب کی فریب کاری اور چیرہ دستی کے باعث مسلمانوں کی کوئی وقعت برقرار نہیں رہ گئی ساتھ ہی وہ ایسے بے یار و مددگار ہوئے کہ کوئی ان کا پرسانِ حال تک نہ رہا۔ ''خضرِ راہ'' کے یہ اشعار غور فرمائیں:

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

اقبال نے مغرب کی عیارانہ حرکات پر کاری ضرب لگائی ہے۔ وہ اسپین میں عربی خون کی چمن بندی و لالہ کاری پر حاوی ہوتی ہوئی مغربیت اور مٹتے ہوئے دینِ اسلامی کے نقوش پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں اور اس تاریخی حقائق سے واقف کراتے ہیں جس کے باعث عالمی پیمانے پر عالی و بلند مرتبت قرار پاتے تھے:۔

تیری بنا پائے دار تیرا ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل
اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب
عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل

اقبال ماضی کی ان حسرت ناک یادوں کے ساتھ انقلاب کی بھی تمنا کرتے ہیں۔ یہ نظم جس دور میں لکھی گئی اس وقت جرمنی میں لوتھر کی

تحریک اصلاح تجدید نے صرف تہذیب وثقافت ہی کو نہیں بلکہ علم کو بھی متاثر کر رکھا تھا۔ جس سے پوپ کی عصمت اور کلیسا کی عظمت اپنی پہلی سی شکل میں برقرار نہ رہ سکی تو دوسری جانب یورپ نے نشاۃ الثانیہ کے ذریعہ ایک نئی کرن پھیلا دی ادھر فرانس میں روسو اور والٹیر نے اپنی سعی و کوشش سے صنعتی انقلاب کا دور شروع کیا ان تبدیلیوں کے پیش نظر قدامت پسند روما بھی انقلاب پر آمادہ ہو گیا۔ اقبال ان حالات سے مضمحل نہیں ہوتے بلکہ عربوں کی گذشتہ یادوں کی جانب ذہن مبذول کراتے ہیں اور حجاز کے مقدس واقعات سے واقف کراتے ہیں:

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں

اقبال ہوں یا قرۃ العین حیدر دونوں ہی مسلمانوں کی تاریخی و تہذیبی زوال کی ذمہ داری اخلاقی گراوٹ، رنگ ونسل اور ذات برادری کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ لڑائی جھگڑے، دنگے فساد، بدزبانی بدکلامی اور لعن طعن کی وجہ سے ہم نے اپنی وراثتوں کو کھو دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں مسلمانوں نے اپنے نسلی اور خاندانی مناقشے کی باعث بڑی بڑی سلطنتیں کھو دی ہیں۔ اقبال اس کا اظہار اپنے اشعار میں یوں کرتے ہے:

جو کرے گا امتیازِ رنگ وخوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

اسی اخلاقی ابتری اور رنگ ونسل کی تقسیم کو قرۃ العین حیدر اپنی تخلیقات میں نمایاں کرتی نظر آتی ہیں۔ مسلم ہی نہیں ہندو اشرفیہ بھی اسی تقسیم کی وجہ سے خسارے کا شکار ہوئے۔ ان کے ناول "اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو" اور "سیتا ہرن" میں اسی اخلاقی گراوٹ کی روداد دیکھنے کو ملتی ہے کہ اپنی تہذیب کو فراموش کر کے آج ہم اور ہمارا سماج کس اخلاقی پستی میں جا گرا ہے جہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل بھائی نہیں دیتی۔

قرۃ العین حیدر انگریزی تعلیم اور طرز زندگی موئید ہوتے ہوئے بھی مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید سے گریز کرتی ہیں نیز اس کے مثبت پہلوؤں سے مستفید ہونے کی ہی حمایت اپنی تخلیقات میں کرتی ہیں۔ علم کی یہی عظمت ورفعت اور وسعتِ قلبی اقبال کے کلام میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ کہتے ہیں:۔

تیرے علم ومحبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

چنانچہ اسلام نے علم کو ہر چیز پر مقدم ٹھہرایا ہے اس لئے اقبال نے دیگر موضوعات کی طرح علم کے معاملے میں بھی وسعتِ نظری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان سب کے باوجود اقبال ہوں یا قرۃ العین حیدر دونوں ہی کولونیل اسٹیٹ کی کامیابی و بالادستی کو مسلمانوں کے لئے مضر گردانتے ہیں۔

اس طرح اقبال وقرۃ العین حیدر دونوں ہی عالمی تاریخ وتہذیب کے پس منظر میں ماضی کے گذشتہ کارناموں کی یاد دہانی کراتے ہوئے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک اہم بات ہے کہ اکثر قرۃ العین حیدر پہ یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی تخلیقات میں اگلی، جرمنی اور فرانس کی باتیں لے کر اڑا کرتی ہیں جبکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ مشرقی تہذیب کے زوال کی بات ہوگی تو پورے مغربی ممالک کا ذکر آنا لازمی ہے لہٰذا قرۃ العین اپنی تصنیفات میں اسی پورے پس منظر کا احاطہ کرتی ہیں۔ خود اقبال بھی ہٹلرزم، ناززم اور یونانی تسلط پر قدغن لگاتے دکھائی دیتے ہیں کیونکہ جب عرب تاریخ اور مشرقی تہذیب کی بات ہوگی تو مغربی ممالک کا ذکر بھی ضرور آئے گا۔ اقبال وقرۃ العین حیدر کی تصانیف پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی مرکز ومحور پہ گردش کرتے ہیں۔

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!

□□□

Dr. Nurina Parveen
Falah-e-Ummat P.G. College
Bhadohi-221401 (U.P)

فرہنگِ آصفیہ سے

آبنائے۔ فذ۔ اسم مؤنث (آب+نائے) (پانی-ملانا-نزدیک لانا)(۱) ناکا۔ (۲) اہلِ جغرافیہ کی اصطلاح میں پانی کے اس چھوٹے قطع کا نام ہے جو دو بڑے پانی کے قطعوں کو ملائے یا دو قطعاتِ خشکی کو جدا کرے۔ جیسے آبنائے باسفورس جو بحر مارمورا کو بحرِ اسود سے ملاتی ہے۔ آبنائے پاک جو ہندوستان اور لنکا کو جدا کرتی ہے۔ آبنائے جبل طارق جو بحر روم کو بحر اوقیانوس سے ملاتی ہے۔ آبنائے بیرنگ۔ جو ایشیا اور امریکہ کو جدا کرتی ہے۔

فیاض عالم

ہندوستان کی پہلی معلّمہ
ساوتری بائی پھولے

19 ویں صدی میں بے شمار اصلاحی و سماجی تحریکات منظر عام پر آئیں جس کے تحت ملک میں رائج فرسودہ رسم ورواج کے خلاف آواز بلند کی گئی اور عوام کو اس کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرایا گیا تاکہ عوام ان فرسودہ رسم ورواج کے منفی پہلو اوراس کے خطرناک نتائج سے بخوبی واقف ہوسکیں۔ اس سلسلے میں راجہ رام موہن رائے، دیا نند سرسوتی، نارائن گرو، رام کرشن پرم ہنس، گوپال ہری دیش مکھ، سرسید احمد خاں، مرزا غلام احمد، کیسو چندر سین اور جیوتی با پھولے جیسی شخصیات اہم ہیں۔ انھیں شخصیات کے شانہ بہ شانہ ایک خاتون جو بہت ہی خاموشی سے سماج کے نچلے طبقے اور بطور خاص خواتین کے بنیادی مسائل کے حل میں مسلسل کوشاں تھیں اس معروف شخصیت کا نام ساوتری بائی پھولے تھا جن کا تعلق مہاراشٹر کے ستارا ضلع سے تھا ان کی پیدائش 3 جنوری 1831 کو ستارا ضلع کے نیا گاؤں میں دلت خاندان میں ہوئی۔ ان کی شادی 9 سال کی چھوٹی سی عمر میں جیوتی با پھولے سے ہوئی ساوتری بائی پھولے کی تعلیم وتربیت اوران کی مستقبل کے سمت میں جیوتی با پھولے نے ہر قدم پران کی رہنمائی کی اوران کی تربیت کا یہ نتیجہ تھا کہ ساوتری بائی کی شخصیت میں ایسی بلند آہنگی اور بے باکی آئی جس کے باعث وہ بیک وقت مرد اساس معاشرے اور برہمن ازم کے خلاف سینہ سپر ہو سکیں۔ ساوتری بائی کا تعلق اسی عہد سے تھا جس میں پورا معاشرہ برہمنوں کے پاکھنڈ، ساہوکاروں اور زمینداروں کے استحصال اور انگریزوں کے مظالم سے دو چار تھا۔ خواتین مرد اساس معاشرے کے ذریعہ بنائے گئے رسوم کے خلاف اپنی شناخت اور بقا کی جنگ لڑ رہی تھیں، ستی سسٹم شباب پر تھا یا پھر جو عورت شوہر کی موت کے بعد ستی نہیں ہوتی اسے معاشرے میں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا اس کے علاوہ یہ رسم بھی رائج تھی کہ شوہر کی موت کے بعد عورت کے سر کے بال کاٹ دیے جاتے تھے۔ خواتین اور دلتوں کو حصول تعلیم کی آزادی کا حق نہیں تھا۔ معاشرے میں نسائی تعلیم کا مطلب بے راہ روی کا شکار ہونا سمجھا جاتا تھا۔ انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ خواتین کی طرز زندگی اور سماجی حالات میں اسی وقت بدلاؤ آسکتا ہے جب انھیں تعلیم سے آراستہ کیا جائے اور اسی مقصد کے تحت انہوں نے سب سے پہلے خواتین کے درمیان تعلیمی بیداری کا کام کرنا شروع کیا اور اس کے لیے اپنے باغ میں آم کے درختوں کے نیچے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا پھر اس کے بعد باضابطہ طور سے تعلیمی نظام سے جڑنے کے لئے 1948 میں اسکول قائم کیا۔ خواتین کی آزادی سلب کر لی گئی تھی ان کی اچھی اور بری تمام چیزوں کا فیصلہ مرد اساس معاشرے کے نام نہاد مذہبی ٹھیکیداروں کے دسترس میں تھا۔ ایسے پر آشوب دور میں ساوتری بائی پسماندہ اور دلت طبقات کے سماجی اور معاشرتی حالات کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ خصوصی طور سے نسائی تعلیم کی طرف توجہ دی اور معاشرے میں رائج 19 ویں صدی کی ان تمام بندشوں کو توڑنے کا کام کیا جو نفرت، فرقہ واریت تفریق، تنگ نظری اور تعصب کا سبب تھیں۔

ساوتری بائی پھولے ہندوستانی تاریخ کا ایسا نام ہے جس نے دلت خواتین کے لیے پر اثر آواز اٹھائی اور خصوصی طور پر ان کی تعلیم پر توجہ دی۔ ان کا یہ فلاحی سلسلہ 1848 سے لے کر ان کی موت کے دن تک چلتا رہا۔ خواتین کی فلاح و بہبود اوران کی تعلیم کے سلسلہ میں ان کی خدمات قابل تعریف ہیں۔ وہ انیسویں صدی کی سب سے مضبوط خاتون تھی جس نے معاشرے کی تمام مخالفتوں کے بعد اپنی پوری زندگی کو معاشرے کے استحصال زدہ لوگوں کے لیے وقف کر دیا۔ وہ دانشور اور

سماجی کارکن کے علاوہ ایک اچھی شاعرہ بھی تھیں جس کی وضاحت ان کے شعری مجموعے 'کاویہ پھولے' کا مطالعہ کرنے سے ہو جا تا ہے۔ انہوں نے اپنی کاوش سے ہندستانی تاریخ کے ایک نئے باب کی شروعات کی جو حقوق انسانی اور حقوق نسواں کا علمبردار تھا۔

یہ اکیسویں صدی جسے سائنس اور ٹکنالوجی کی صدی سے تعبیر کیا جاتا ہے میں بھی ہمارے ملک میں دلتوں کی جو حالت ہے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوگا کہ 150 سال قبل ان کی کیا حالت رہی ہوگی اور جن لوگوں نے ان کی اصلاح اور تعلیم پر توجہ دی ہوگی انھیں معاشرے کے زدو کوب کا جس طرح شکار ہونا پڑا ہوگا اس کا ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ایسے دور میں جیوتی با پھولے اور ساوتری نے مانگا اور مہار خاندانوں کے درمیان جا کر کام کیا۔ ان برادریوں کا تعلق مہاراشٹر کے سب سے نچلے طبقے سے تھا۔جس کے لیے انھیں معاشرے کے اعلی طبقے سے لے کر اپنے گھر اور خاندان کے لوگوں کے زدو کوب کا شکار ہونا پڑا۔ ساوتری بائی کے بھائی نے انھیں ایک خط میں لکھا کہ ''تم جو کام کر رہی ہو وہ سماج کو خراب کرنے والا ہے۔'' جس کا جواب ساوتری بائی نے ان لفظوں میں دیا۔ ''تم بکری اور گائے کو سہلاتے رہو لیکن دلتوں کو تم انسان نہیں اچھوت مانتے ہو'' ساوتری بائی کے اس جواب سے ان کی بلند آہنگی اور نقطہ نظر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ساوتری بائی نے teacher training مکمل کرنے کے بعد اپنے شوہر کے مشورہ سے 1 جنوری 1848 کو پونا کے بدھ وارا پیٹھ میں بھڈے کے مکان میں پہلا گرلس اسکول قائم کیا جس کی نہ صرف وہ پہلی پرنسپل بنی بلکہ اسی اسکول کو پونا میں heirtage کا درجہ حاصل ہے۔ انھیں ملک کی پہلی خاتون معلم (ٹیچر) بننے کا بھی شرف حاصل ہوا انہوں نے یہ قدم ایسے دور میں اٹھایا جس دور میں لڑکیوں کو گھر کی چوکھٹ سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی ایسے سماج میں ان کے اس قدم نے معاشرے میں انقلاب برپا کرنے کا کام کیا۔انھیں Mother of Modern Education اور First LadyTeacher of India کے نام سے جانا جاتا ہے اسکول شروع ہونے کے پہلے ہی دن الگ الگ برادری کی نو لڑکیوں نے اس میں داخلہ لیا اور ان کی محنت اور حسن اخلاق کی بدولت اسکول میں داخلہ لینے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ اس اسکول میں پسماندہ اور نچلے طبقے کی لڑکیاں خصوصی طور سے حصول علم کے لیے آنے لگیں۔ روز بہ روز اسکول میں داخلہ لینے والی لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ دیکھ کر گاؤں اور علاقے کے لوگوں نے ساوتری بائی اور ان کے اس اسکول کی سخت مخالفت کی اور اسکول کو بند کرنے کی دھمکی دی لیکن ساوتری بائی کی ہمت اس چٹان کے مانند تھی جسے کوئی ہلا نہیں سکتا تھا۔ بالآخر لوگ انھیں جان سے مارنے کی دھمکی دینے لگے جب اس سے بھی بات نہیں بنی تو جب وہ گھر سے اسکول کے لیے نکلتی تو راستے میں لوگ ان پر کوڑا کرکٹ گندگی، گوبر اور پتھر پھینکنے لگے جس کے باعث اسکول پہنچتے پہنچتے ان کا چہرہ اور کپڑا خراب ہو جاتا۔ آئے دن رونما ہونے والے ان مظالم نے انھیں ذہنی طور پر کافی پریشان کیا۔ اس بحرانی دور میں ان کے شوہر نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے ساتھ دو ساڑی رکھیں اسکول پہنچنے کے بعد خراب ساڑی کو بدل لیں اور صاف کو زیب تن کر لیں شوہر کے اس مشورے نے جہاں مسئلے کا حل نکال دیا وہیں دوسری طرف انھیں اپنے مشن میں مزید استحکام بخشنے کا بھی کام کیا۔ جس کے باعث 1948 سے لے کر 1952 کے درمیان ان کے ذریعہ مزید 18 اسکولوں کا قیام عمل میں آیا۔سماج کے پسماندہ و محروم طبقہ کے لوگوں کے تئیں ساوتری بائی کی ہمدردی اور ان کے کاموں کے اعتراف میں برٹش حکومت کے محکمہ تعلیم نے 16 نومبر 1952 کو انھیں شال پیش کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ساوتری بائی پھولے کی دور اندیشی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس نقطے سے انہوں نے 1855 میں کام شروع کیا تھا اس پر حکومت ہند کو پالیسی بنانے میں لگ بھگ 133 سال لگ گئے اور 1988 میں National Litracy Mission کے تحت تعلیم بالغاں کا آغاز کیا گیا جس کا مقصد 15 سے 35 سال تک کے Non Litrary کو Literate کرنا تھا۔ اس کے علاوہ سرو شکشا ابھیان جس کے تحت 14 سال تک کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم کا بندوبست جیسی اسکیم کے ابتدائی نقوش ہمیں ساوتری بائی پھولے کے یہاں صاف طور سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔انہوں نے Drop out students کو وظیفہ دے کر دوبارہ اسکولی نظام سے جڑنے میں مدد کی۔ ساتھ ہی پیشہ وارانہ تعلیم دے کر انھیں خود مختار بنانے کا بھی کام کیا۔ساوتری بائی پھولے کا تعلق گرچہ انیسویں صدی سے تھا مگر 21 ویں صدی میں بھی ان کے نظریات کی اہمیت و افادیت دیکھنے کو ملتی ہے۔1948 سے 1952 تک کے ان چار سالوں میں ان کے نظریے میں کافی تبدیلی ہوئی جس کے باعث وہ اب خواتین کو منظم کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئیں۔ 1852 میں ''مہیلا منڈل'' کا قیام ان کی اسی نقطہ نظر کی دین ہے اس تنظیم کا مقصد تعلیم کے ساتھ خواتین کو ان کی بنیادی مسائل اور اس کے حل کے سلسلے میں متحد کرنا

اوران میں بیداری لاتا تھا۔اس تنظیم نے کم عمری میں شادی، ستی سسٹم، بیواؤں کے بال کٹوانے کی مخالفت، بے میل شادی، جہالت، ذات پات اور مذہبی ضعیف الاعتقادی، غلط رسم ورواج، رنگ ونسل کی بنیاد پر تفریق کوختم کرنے میں نمایاں رول ادا کیا۔اس سلسلے میں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد بیواؤں کے منڈن کی جو رسم ہوتی تھی جس کے تحت بیواؤں کے سر کے بال اتار دیے جاتے تھے اس کے لیے انہوں نے نائیوں کے درمیان جاکر اس فرسودہ نظام کے نقصانات سے انھیں آگاہ کرنے کا کام کیا اور انھیں اس منڈن کی رسم سے دور رہنے کا مشورہ دیا جس کے خاطر خواہ نتائج سامنے آئے اور نائیوں نے منظم طور سے منڈن کی رسم کو کرنے سے منع کردیا۔

ان کی تحریک نے کسی ایک مخصوص طبقے تک محدود نہ ہوکر پورے معاشرے میں بیداری لانے کا کام کیا۔انہوں نے تعلیم نسواں کے ساتھ فاطمہ شیخ جو ان کی دوست تھیں جنہوں نے ہر قدم پر ساوتری بائی کی مدد کی اور شانہ بہ شانہ ان کے ساتھ چلتی رہی ان کی مدد سے ان کے بھائی عثمان شیخ کے نام سے Adult education تعلیم بالغاں کے لیے ایک الگ اسکول قائم کیا اس کے علاوہ 1855 میں مزدوری کرنے والے لوگوں کے لیے رات کا مکتب قائم کیا تو دوسری طرف بیواؤں کے رہنے کے لیے ودھوا آشرم ،بنوانے کا بھی کام کیا۔اس کے علاوہ فرسودہ نظام کے باعث دلت اور اعلی طبقے کے لوگ ایک کنوئیں سے پانی نہیں لے سکتے تھے ایسے میں 1968 میں انہوں نے اپنے گھر کے کنوئیں کو ہر خاص وعام کے لیے وقف کردیا۔تاکہ علاقے کے سبھی لوگ بلا تفریق اس سے فیضیاب ہوسکیں۔1857 کے سوکھے کے وقت دروازہ، دروازہ گھوم کر لوگوں سے چندہ جمع کرکے ہزاروں متاثرہ خاندانوں کو فاقہ کشی سے مرنے سے بچانے کا کام کیا۔ساوتری بائی کی بلند آہنگی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد آخری رسوم کی ساری ذمہ داری انھوں نے خود ہی اٹھانے کا کام کیا۔اپنے شوہر کے انتقال کے بعد ان کے ادھورے مشن کو ساوتری بائی نے بہت ہی خوبصورتی سے آگے بڑھایا ان کا یہ سلسلہ ان کی زندگی کے آخری ایام تک چلتا رہا۔

24 ستمبر 1873 میں ان کے ذریعہ قائم کی گئی تنظیم ''ستیہ شودھک سماج'' نے دلتوں اور پسماندہ طبقات کو استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کا کام کیا اس کے ذریعہ انھوں نے متوا سرتی میں دلتوں کے متعلق نظریات سے لوگوں کو آگاہ کیا معاشرہ میں رائج فرسودہ نظام کی بے خوف ہوکر مخالفت کی۔اس تحریک سے بعد میں کولہاپور کے راجا ''ساہوجی مہاراج بھی وابستہ ہوئے ساہوجی مہاراج کی وابستگی سے یہ تحریک اور فعال ہوئی۔اس تنظیم نے غریب اور نادار بچوں کو قحط کے دنوں میں رہنے اور کھانے پینے کا بھی انتظام کیا۔اس کے علاوہ 28 جنوری 1953 کو ''بال ہتیا پرتی بندھک گرہ'' کی بنیاد ڈالی جس میں بیواؤں کی صحت مند زچگی اور نوزائدہ بچوں کو بچانے اور ان کی پرورش کا معقول انتظام کیا گیا تھا اس کے علاوہ بیواؤں کے مسائل کے حل کے لیے تدابیر بھی کی جاتی تھی۔اس کے لیے انھوں نے ودھوا پنر وواہ سبھا، قائم کی جس کا مقصد بیواؤں کی شادی کے لیے معاشرے میں رائے عامہ تیار کرنا تھا۔ساتھ ہی بیواؤں کے بنیادی مسائل سے لوگوں کو واقف کرانا تھا۔1857 میں انہوں نے پلیگ جیسی مہلک بیماری سے متاثر لوگوں کے علاج کے لیے ایک کلینک کھولنے کا کام کیا جس میں مریضوں کی مفت دیکھ بھال، دوا علاج کا انتظام تھا مریضوں کے علاج ومعالجے کے دوران وہ خود اس بیماری کے زد میں آگئیں اور پھر آخرکار پلیگ کے infection سے مارچ 1897 میں ان کا انتقال ہوا۔یہاں یہ امر بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان کے ذریعہ کیے جانے والے تمام فلاحی خدمات میں ان کے شوہر محترم جیوتی با پھولے ان کے شانہ بہ شانہ رہے ان دونوں نے مل کر استحصال ظلم وتشدد اور تفریق سے پاک معاشرے کی تعمیر کی بنیاد رکھی جس کی چند تصویر ہمیں بعد کے دنوں میں بخوبی دیکھنے کو ملتی ہے۔ان کی زندگی میں ان کے ذریعے کیے گئے اقدامات اور خدمات پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی لیکن ان کی موت کے بعد لوگوں نے ان کے ذریعے کی گئی خدمات کی تعریف کی اور ان کے نام سے سرکاری مختلف اسکیموں اور تعلیمی اداروں کو جوڑ کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور گوگل نے بھی اس پہلی women rights icon (نسائی Activist) کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کی 186 ویں یوم پیدائش 3 جنوری 2017 کے موقع پر doodle کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کیا۔

ان کے ذریعے کیے گئے اقدامات کا اعتراف آج ہر خاص وعام کررہا ہے۔جس کے باعث وہ خصوصی طور پر خواتین کی رول ماڈل کے طور پر ہندستانی منظر نامے پر ایک ایسے درخشندہ ستارے کے مانند سامنے آئیں جس کی چمک آنے والی نسلوں خصوصا طبقہ نسواں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔□□□

Faiyaz Alam
L-19/A, IInd Floor, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025

نئے آرڈیننس میں عورتوں و بچیوں کی عصمت دری کے لیے سخت سزائیں

خواجہ عبدالمنتقم

ہم سب اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ عورت کی عصمت، عفت و حرمت کا تقدس نسل انسانی کے عزیز ترین مفادات میں سے ایک ہے اور کوئی بھی کریم النفس انسان اور انسان ہمدرد معاشرہ جنسی جرائم کے انسداد اور ان کی سخت سزا سے متعلق اقدامات کی مخالفت نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس طرح کے واقعات کی طرف سے دیدہ دانستہ چشم پوشی اختیار کر سکتا ہے خواہ مجرم کی عمر کتنی ہی کم کیوں نہ ہو چونکہ خواہش شہوانی اور اس کے بعد اس قسم کی حرکات خود اس بات کا ثبوت ہوتی ہیں کہ مجرم تقریباً سن بلوغ کو پہنچ چکا ہے۔ نربھیا معاملے کے بعد مرکزی حکومت نے تعزیری قوانین میں خاص کر، مجموعہ تعزیرات بھارت کی دفعہ 376 کو، جس میں عصمت دری کے لیے سزا تجویز کی گئی ہے، سخت ترین بنایا تھا مگر حسب توقع اس کے نتائج بھی اطمینان بخش نہیں رہے۔ کشمیر اور اناؤ میں دو معصوم بچیوں کے ساتھ جس درندگی کا مظاہرہ کیا گیا تھا اس کے مدنظر مرکزی حکومت نے صدر مملکت کے ذریعہ جاری کیے گئے تعزیری قانون (ترمیم) آرڈیننس، 2018 کے ذریعہ دفعہ 376 میں مزید ترامیم کی ہیں تاکہ مجرمین کو سخت سے سخت سزا دی جا سکے۔

اس سے قبل کہ متذکرہ بالا آرڈیننس کی مشمولات کا جائزہ لیا جائے، ہم یہاں قارئین کو اور خاص کر خواتین کو یہ بتانا چاہیں گے کہ آرڈیننس کب اور کیوں جاری کیا جاتا ہے؟ پارلیمنٹ کے وقفے کے دوران یعنی جب پارلیمنٹ بر سر اجلاس نہ ہو تو صدر جمہوریہ ہند کو قانون سازی کی بابت وہی اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو پارلیمنٹ کو حاصل ہیں۔ جس طرح پارلیمنٹ کسی بل پر ضروری بحث اور غور و فکر کے بعد اسے منظوری دیتی ہے اور بعد ازاں وہ بل صدر کی منظوری کے بعد قانون کی شکل اختیار کر لیتا ہے اسی طرح صدر بھی پارلیمنٹ کے وقفے کے دوران ضرورت پڑنے پر آرڈیننس جاری کر سکتے ہیں۔ انھیں صرف یہ اطمینان کرنا ہوتا ہے کہ کیا واقعی ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ جس کے تحت آرڈیننس جاری کیا جانا اشد ضروری ہے۔ وہ اپنی رائے کیبنٹ کی دی گئی صلاح کی بنیاد پر قائم کرتے ہیں۔

آئین کی دفعہ 123 کے تحت جاری کیے گئے آرڈیننس کے مطابق دفعہ 376 کا ترمیم شدہ متن درج ذیل ہے:

"دفعہ 376:(1) جو کوئی، ان صورتوں کے سوا جن کی نسبت ذیلی دفعہ (2) میں توضیح کی گئی ہے، زنا بالجبر کا ارتکاب کرے، اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی اس مدت تک کی قید با مشقت کی سزا دی جائے گی جو 10 سال سے کم نہ ہو لیکن جو عمر قید تک کی ہو سکتی ہے اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

(2) جو کوئی—

(الف) پولس افسر ہوتے ہوئے زنا بالجبر کا ارتکاب کرے—

(i) حذف کیا گیا

(ii) کسی اسٹیشن ہاؤس کے احاطے میں؛ یا

(iii) کسی ایسی عورت کے ساتھ جو اس کی یا اس کے ماتحت کسی پولس افسر کی تحویل میں ہو؛ یا

(ب) سرکاری ملازم ہوتے ہوئے، کسی ایسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کرے جو ایسے سرکاری ملازم کی یا اس کے ماتحت سرکاری ملازم کی تحویل میں ہو؛ یا

(ج) مرکزی یا ریاستی حکومت کے ذریعہ کسی علاقے میں تعینات مسلح افواج کا رکن ہوتے ہوئے ایسے علاقے میں زنا بالجبر کا ارتکاب کرے؛ یا

(د) جیل، ریمانڈ ہوم یا کسی فی الوقت نافذ قانون کے ذریعے یا اس کے تحت قائم کی گئی تحویل کی دیگر جگہ یا عورتوں یا بچوں کے ادارے کی انتظامیہ یا عملے کا رکن ہوتے ہوئے ایسی جیل، ریمانڈ ہوم، جگہ یا ادارے کے کسی مکین کے ساتھ زنا بالجبر کرے؛ یا

(ہ) کسی اسپتال کی انتظامیہ یا عملے کا رکن ہوتے ہوئے کسی ایسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کرے جو اس اسپتال میں ہو؛ یا

(و) کسی عورت کا رشتہ دار، ولی یا استاد یا امانت دار یا حاکم ہوتے ہوئے ایسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کرے؛ یا

(ز) فرقہ وارانہ یا فرقہ پرستانہ تشدد کے دوران زنا بالجبر کرے؛ یا

(ح) کسی ایسی عورت کے ساتھ یہ جانتے ہوئے کہ وہ حاملہ ہے زنا بالجبر کا ارتکاب کرے؛ یا

(ط) کسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کرے جبکہ وہ 16 سال سے کم عمر کی ہو؛ یا

(ی) اجتماعی زنا بالجبر کا ارتکاب کرے، یا

(ک) کسی ایسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کرے جو اپنی رضامندی ظاہر کرنے کے لائق نہ ہو؛ یا

(ل) کسی ایسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کرے جو اس کے کنٹرول (نگرانی) یا اثر (Dominance) میں ہو؛ یا

(م) کسی ایسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کرے جو کسی جسمانی یا ذہنی معذوری کا شکار ہو؛ یا

(ن) جو کسی ایسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کرتے ہوئے، اسے شدید جسمانی مضرت پہنچائے، یا اس کے کسی عضو کو بیکار کر دے یا اس کی شکل بگاڑ دے یا اس کی جان خطرے میں پڑ جائے؛ یا

(ف) اسی عورت کے ساتھ بار بار زنا بالجبر کرے۔

اسے اس مدت تک کی قید با مشقت کی سزا دی جائے گی جو 10 سال سے کم نہ ہو لیکن جو عمر قید تک ہو سکے گی یعنی اس کی بقایا قدرتی زندگی تک اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا:

تشریح: اس ذیلی دفعہ کی اغراض کے لیے—

(الف) ''مسلح افواج'' سے مراد ہیں بحری، بری اور ہوائی افواج اور اس میں شامل ہیں فی الوقت نافذ قانون کے تحت تشکیل کی گئی مسلح افواج بشمول پیرا ملٹری جمعیت (paramilitary forces) و معاون جمعیت (auxiliary forces)، جو مرکزی حکومت یا ریاستی حکومت کے کنٹرول کے تحت ہوں، کا کوئی رکن؛

(ب) ''اسپتال'' سے مراد اسپتال کا احاطہ ہے اور اس میں دوران بحالیٔ صحت اشخاص یا ان اشخاص کو جنھیں طبی توجہ یا بحالی کی ضرورت ہو، رکھنے اور ان کے علاج کے لیے کسی ادارے کا احاطہ شامل ہے۔

(ج) ''پولیس افسر'' کی اصطلاح کے وہی معانی ہوں گے جو اس کے پولس ایکٹ، 1861 میں ہیں۔

(د) اصطلاح ''عورتوں یا بچوں کا ادارہ'' سے ایسا ادارہ مراد ہے، خواہ اسے یتیم خانہ یا بے توجہی کی شکار عورتوں یا بچوں کا گھر یا بیوگان کا گھر یا کسی دیگر نام سے پکارا جائے، جو عورتوں یا بچوں کو رکھنے اور ان کی پرداخت کے لیے قائم کیا گیا اور چلایا جا رہا ہو۔

(3) جو کوئی 16 سال سے کم عمر کی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کرتا ہے، اسے اس مدت تک کی قید با مشقت کی سزا دی جائے گی جو 20 سال سے کم نہ ہو لیکن جو عمر قید تک کی ہو سکتی ہے یعنی اس کی بقایا قدرتی زندگی تک کی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

مگر شرط یہ ہے کہ جرمانہ اتنا ہوگا جس سے ستم رسیدہ شخص کے طبی اور بازآبادکاری کے اخراجات کو بخوبی پورا کیا جاسکے؛

مگر مزید شرط یہ ہے کہ اس ذیلی دفعہ کے تحت عائد کیے گئے جرمانے کی رقم ستم رسیدہ کو دی جائے گی۔

دفعہ 376 الف: جو کوئی دفعہ 376 کی ذیلی دفعہ (1) یا ذیلی دفعہ (2) کے تحت قابل سزا کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے اور ایسے ارتکاب کے دوران کوئی ایسی مضرت پہنچاتا ہے جس کے سبب عورت کی موت ہو جاتی ہے یا وہ عورت مسلسل* vegetative state (بے خبری کی حالت میں زندہ ناکارہ زندگی)، اسے اس مدت تک کی قید با مشقت کی سزا دی جائے گی جو 20 سال سے کم نہ ہو لیکن جو عمر قید تک کی ہو سکتی ہے یعنی اس کی بقایا قدرتی زندگی تک کی، یا سزائے موت دی جائے گی۔

*A wakeful unconscious state that lasts longer than a few weeks is referred to as a persistent vegetative state

دفعہ 376 الف ب: جو کوئی 12 سال سے کم عمر کی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کرتا ہے، اسے اس مدت تک کی قید با مشقت کی سزا دی جائے گی جو 20 سال سے کم نہ ہو لیکن جو عمر قید تک کی ہو سکتی ہے یعنی اس کی بقایا قدرتی زندگی تک کی، اور اس کے ساتھ ساتھ اس پر جرمانہ بھی عائد ہوگا یا اسے سزائے موت دی جائے گی۔

مگر شرط یہ ہے کہ جرمانہ اتنا ہوگا جس سے ستم رسیدہ شخص کے طبی

اور بازآبادکاری کے اخراجات کو بخوبی پورا کیا جاسکے؛

مگر مزید شرط یہ ہے کہ اس دفعہ کے تحت عائد کیے گئے جرمانے کی رقم ستم رسیدہ کو دی جائے گی۔

دفعہ 376ج: جو کوئی—

(الف) اپنی با اختیار یا ماتحتی حیثیت میں؛ یا

(ب) سرکاری ملازم ہوتے ہوئے؛ یا

(ج) کسی جیل، ریمانڈ ہوم یا کسی فی الوقت نافذ قانون کی رو سے یا اس کے تحت قائم کی گئی تحویل کی دیگر جگہ یا عورتوں یا بچوں کے کسی ادارے کا سپرنٹنڈنٹ یا منتظم ہوتے ہوئے؛ یا

(د) کسی اسپتال کی انتظامیہ یا عملے کا رکن ہوتے ہوئے اپنی اس حیثیت یا ماتحتی تعلق کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تحویل یا اپنے تحت یا اسپتال کے حدود میں موجود کسی عورت کو اپنے ساتھ جنسی مباشرت کے لیے ترغیب دے یا بہلائے پھسلائے، اس کی یہ جنسی مباشرت زنا بالجبر کے درجے میں نہیں آئے گی اور اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی کم از کم 5 سال کی قید با مشقت اور زیادہ سے زیادہ 10 سال تک کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

تشریح-1: اس دفعہ میں "جنسی مباشرت" سے کوئی بھی ایسا فعل مراد ہے جسے دفعہ 375 کے فقرہ جات (الف) تا (د) میں درج کیا گیا ہے۔

تشریح-2: اس دفعہ کی اغراض کے لیے، دفعہ 375 کی تشریح 1 بھی لاگو ہوگی۔

تشریح-3: کسی جیل، ریمانڈ ہوم یا تحویل کی دیگر جگہ یا عورتوں یا بچوں کے کسی ادارے کی نسبت "سپرنٹنڈنٹ" میں وہ شخص شامل ہے جو ایسی جیل، ریمانڈ ہوم، جگہ یا ادارے میں کسی ایسے عہدے پر فائز ہو جس کی رو سے وہ اس کے مکینوں پر اختیار یا نگرانی کا استعمال کرسکے۔

تشریح-4: "اسپتال" اور "عورتوں یا بچوں کا ادارہ" سے بالترتیب وہی مراد ہوگا، جو ان سے دفعہ 376 کی ذیلی دفعہ (2) میں مراد ہے۔

اجتماعی زنا بالجبر (Gang rape)

دفعہ 376د: جہاں ایک یا ایک سے زیادہ افراد کسی گروپ کی شکل میں یا بہ پیش رفت غرض مشترکہ کسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کرتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک کی بابت یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے زنا بالجبر کے جرم کا ارتکاب کیا ہے اور اسے اس مدت تک کی قید با مشقت کی سزا دی جائے گی جو 20 سال سے کم نہ ہو لیکن جو عمر قید یعنی اس کی بقایا قدرتی زندگی تک کی ہو سکتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس پر جرمانہ بھی عائد ہوگا۔

مگر شرط یہ ہے کہ جرمانہ اتنا ہوگا جس سے ستم رسیدہ شخص کے طبی اور بازآبادکاری کے اخراجات کو بخوبی پورا کیا جاسکے؛

مگر مزید شرط یہ ہے کہ اس دفعہ کے تحت عائد کیے گئے جرمانے کی رقم ستم رسیدہ کو دی جائے گی۔

دفعہ 376دالف: جہاں ایک یا ایک سے زیادہ افراد کسی گروپ کی شکل میں یا بہ پیش رفت غرض مشترکہ کسی 16 سال سے کم عمر کی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کرتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک کی بابت یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے زنا بالجبر کے جرم کا ارتکاب کیا ہے اور اسے عمر قید یعنی اس کی بقایا قدرتی زندگی تک کی سزا دی جائے گی اور اس کے ساتھ ساتھ اس پر جرمانہ بھی عائد ہوگا۔

مگر شرط یہ ہے کہ جرمانہ اتنا ہوگا جس سے ستم رسیدہ شخص کے طبی اور بازآبادکاری کے اخراجات کو بخوبی پورا کیا جاسکے؛

مگر مزید شرط یہ ہے کہ اس دفعہ کے تحت عائد کیے گئے جرمانے کی رقم ستم رسیدہ کو دی جائے گی۔

دفعہ 376دب: جہاں ایک یا ایک سے زیادہ افراد کسی گروپ کی شکل میں یا بہ پیش رفت غرض مشترکہ کسی 12 سال سے کم عمر کی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کرتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک کی بابت یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے زنا بالجبر کے جرم کا ارتکاب کیا ہے اور اسے عمر قید یعنی اس کی بقایا قدرتی زندگی تک کی سزا دی جائے گی اور اس کے ساتھ ساتھ اس پر جرمانہ بھی عائد ہوگا، یا سزائے موت دی جائے گی۔

مگر شرط یہ ہے کہ جرمانہ اتنا ہوگا جس سے ستم رسیدہ شخص کے طبی اور بازآبادکاری کے اخراجات کو بخوبی پورا کیا جاسکے؛

مگر مزید شرط یہ ہے کہ اس دفعہ کے تحت عائد کیے گئے جرمانے کی رقم ستم رسیدہ کو دی جائے گی۔"

اس آرڈیننس کے ذریعہ بچوں کو جنسی جرائم سے تحفظ ایکٹ، 2012 کی دفعہ 42 میں ترمیم کرکے یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اگر کسی ایسے جرم کا ارتکاب ہوتا ہے جو مجموعہ تعزیرات بھارت اور بچوں کو جنسی جرائم سے تحفظ ایکٹ، 2012، دونوں ہی قوانین کے تحت جرم ہے تو مجرم کو اس ایکٹ کے تحت سزا دی جائے گی جس میں زیادہ سزا کا التزام ہے۔

KHWAJA ABDUL MUNTAQIM
2-I.P. EXTN
DELHI-110092

میراث

پروفیسر شاہدہ شاہین

رافعیہ بیگم ایک باوقار اور جاذب نظر خاتون تھیں، چہرے کے نقوش شاہد تھے کہ عہد جوانی میں یقیناً بے حد حسین اور پرکشش رہی ہوں گی ...... جھیل سی گہری آنکھیں، فراخ ماتھا، لمبی ستواں ناک، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نازک ہونٹ ہنوز ان کو سرِ محفل نمایاں رکھنے کے لیے کافی تھے۔ وہ اپنے مثالی روپ رنگ کی طرح عادات واطوار میں بھی یکتا تھیں۔ شوہر کے گزر جانے کے بعد گھرانے کی آن بان وشان کو ویسے ہی برابر برقرار رکھے ہوئے تھیں، وضع داری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ اپنی تینوں لڑکیوں کی شادی خانہ آبادی کے فرض سے بخیر وخوبی سبکدوش ہونے کے بعد اکلوتے بیٹے کے لیے ایک اعلیٰ خاندانی لڑکی بیاہ لانے کی تگ ودو میں تھیں۔

حیرت کی بات تھی کہ ان کے متناسب وقابلِ تحسین خدوخال ان کی اولاد کے حصے میں نہیں آئے تھے۔ تینوں لڑکیاں حتیٰ کہ مشرف بھی اپنے باپ پر گیا تھا۔ گو پدرانہ رنگ روپ لڑکیوں کی شخصیت کو ممیز بنانے میں موثر ثابت نہیں ہوا تھا پر مشرف پر خوب جچتا تھا۔ سروقد، ہلکا سانولا رنگ، تیکھے نین نقوش پر سرمایہ دارانہ رعب وداب سمیت مردانہ حسن کا جیتا جاگتا شاہ کار نظر آتا تھا۔ علاوہ ازیں اعلیٰ تعلیم یافتہ، وسیع وعریض جائداد کا اکلوتا وارث مشرف نواز لازمی طور پر شہر کا سب سے مشہور ومطلوب کنوارا تھا جس پر خاص الخاص اشخاص کی متمنی نظریں لگی ہوئی تھیں۔

رافعیہ بیگم سمیت ان کی تینوں لڑکیاں سناٹے میں آگئیں جب مشرف نے اچانک اعلان کردیا کہ وہ اپنی شریکِ حیات کا انتخاب کر چکا ہے.....

"یا اللہ خیر! لڑکا نہ جانے کہاں جا کر قربان ہوگیا۔ ایک ہی تو وارث ہے خاندان کا۔ کیا کیا نہ سوچا تھا..... اس کی دلہن کا انتخاب اعلیٰ حسب نسب سب کچھ دیکھ بھال کر خوب چھان پھٹک کر کریں گے۔ اب پتہ نہیں یہ کس چڑیا کو لا کر ہمارے سر منڈھنے والا ہے!"

مشرف کا دل ارفع ترین کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو چکا تھا۔ ارفع جسے اس نے شروع سے پسندیدہ نظروں سے دیکھا تھا حسن وذہانت کا ایک لاجواب امتزاج تھی۔ وہ اس کے جگری دوست ہمایوں کی چھوٹی بہن تھی۔ پسندیدگی رفتہ رفتہ محبت میں تبدیل ہوگئی، پر مشرف کو احساس تھا کہ اس کے انتخاب کو گھر میں کسی کی پشت پناہی نہیں ملے گی کیونکہ ارفع کا تعلق ایک انتہائی نادار گھرانے سے تھا۔ ارفع اور ہمایوں کے والدین بچپن میں ہی گزر گئے تھے۔ ان کی نانی امی نے محلے بھر کے کپڑے سی کر ان دونوں کی پرورش کی تھی۔

آخرکار مشرف کے راسخ اور بے لوث جذبوں کو کامیابی ملی۔ ارفع ترین اس کی رفیقِ حیات بن کر اس کے گھر آگئی۔ بیٹے کی پسند پر رافعیہ بیگم نے مجبوراً سمجھوتا کر لیا لیکن اتنی بڑی حقیقت ان کی لڑکیوں کے گلے سے اترنا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ انہیں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سارے شہر میں نکو بن کر رہ گئی ہیں کیونکہ کسی بھی زاویے سے دو خاندانوں کے بیچ مماثلت نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی، مشرف ان کی زبوں حالی سے زچ ہو کر جلد ہی ارفع سے قطع تعلق کر لے گا۔

ارفع ترین ایک مقناطیسی شخصیت کی مالک تھی۔ اس کے بے مثال خدوخال اور شیریں لب ولہجہ اور مہذب طرزِ تکلم کی وجہ سے جو بھی اس کے رابطے میں آتا اس کا گرویدہ ہو کر رہ جاتا۔ گھر کے نوکر تو پہلی نظر میں اس پر جان چھڑکنے لگے تھے۔ پہلے پہل رافعیہ بیگم بھی ارفع کے بارے میں کوئی

خوش کن رائے نہیں رکھتی تھیں لیکن ارفع نے محسوس کیا تھا کہ رفتہ رفتہ ان کے رویہ میں تبدیلی آرہی ہے اور ان کے سلوک میں لچک اور نرمی شامل ہونے لگی ہے۔ اس کی نندیں تھیں جو ہمیشہ اس کی نکتہ چینی پر کمربستہ رہتی تھیں۔ ماں اور بھائی کی لاعلمی میں اس کے میکے والوں کے ادنیٰ معیارِ زندگی اور پست حالات کو موضوع بنا کر اس قدر تذلیل کی جاتی کہ اس کے آنسو نکل آتے۔ اس کے برعکس رافیعہ بیگم ایسے خفیف نقائص کو در خورِ اعتنا نہیں سمجھتی تھیں ہمیشہ اسے نادان معصوم کمسن اور ناتجربہ کار کہہ کر اس کی کوتاہیوں کو نظر انداز کر دیتیں۔

بھائی کی شادی خانہ آبادی کے فوراً بعد تینوں لڑکیاں نادانستہ طور پر ایک عجیب کش مکش میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ حالانکہ جس گھر میں پیدا ہوئیں، پلی بڑھیں اس گھر کا آنگن وداعی کے ساتھ ہی ان کے لیے پرایا ہو گیا تھا۔ لٰہذا بعد بہو کی آمد کے اجنبیت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا لیکن بچپن سے لیکر جن اشیا کو اپنا سمجھا تھا، برتا تھا، جس ماحول سے انسیت رہی تھی اس سے دست بردار ہو جانا اتنا آسان نہیں تھا۔ ان کے لیے یہ ایک ناقابلِ برداشت امر تھا کہ عین ان کی ناک کے نیچے ایک نوارد ہستی کل موروثی املاک پر اپنے مالکانہ حقوق اور تسلط قائم کیے جا رہی تھی۔ خصوصاً جب یہ ملاحظہ کرتیں کہ رافیعہ بیگم بھی انتہائی اہمیت کے حامل گھریلو امور میں ان تینوں کے بجائے بہو پر تکیہ کرنے لگی ہیں تو مزید تحقیر اور احساس کمتری کا شکار ہو جاتیں۔

یہ اور بات تھی کہ ان کی اپنی سسرال میں کسی چیز کی قلت نہیں تھی۔ کم وبیش ساری سہولیات میسر تھیں۔ باپ کے گزر جانے کے بعد شرعی طور پر جائداد میں ان کا حصہ بھی الگ کر کے ان کے حوالے کیا جا چکا تھا۔ بااین ہمہ ان کا مسئلہ یہ تھا کہ لیک وباوقار طریقے سے قناعت کی راہ اپناتے ہوئے ازلی قانون اور حقیقتِ حال سے سمجھوتا کر لینے کے بجائے بے جا حرص وطمع کے زیر اثر اپنے وقار کو ضائع کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

مشرقی تہذیب کے حامل بیشتر گھرانوں میں اس نوعیت کے نفسیاتی مسائل عام ہیں۔ کل کی آئی بہو کی دن بدن بڑھتی ہوئی ہر دلعزیزی اور مقبولیت گھر کی بیٹیوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ چنانچہ در پردہ ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ مدمقابل کو نیچا دکھانے اور ذلیل کرنے کا ایک موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔ اچھے بھلے ماحول میں کچھ اس طرح زہر گھول دیا جاتا ہے کہ سامنے والا صفائی دینے کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ نتیجے میں ایک نئی نویلی معصوم کے ارمانوں اور خوشیوں پر حسد اور رقابت کے بادل سایہ فگن ہو جاتے ہیں اور زندگی اجیرن ہو کر رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھی معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ بہرحال عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے۔

ادھر ارفع ترین اپنے شوہر کی بے لوث محبت کے نشے میں اس قدر سرشار تھی اور ساس کی بے پایاں شفقت نے وہ اعتماد عطا کیا تھا کہ کسی کی جلی کٹی باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ مگر قدرت نے ارفع کی آزمائش اور ثابت قدمی کے امتحان کا ایک اور ہی منصوبہ باندھ رکھا تھا۔ مشرف اچانک کسی موسمی بخار میں مبتلا ہوا اور بیماری سے جانبر نہ ہو سکا۔ دیکھتے دیکھتے سب کو روتا تڑپتا چھوڑ راہیِ ملکِ عدم ہو گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا۔ گھر پر نحوست کے سائے منڈلانے لگے۔ اس سانحہ کے بعد رافیعہ بیگم نے جو کھٹیا پکڑی تو پھر نہ اٹھ سکیں۔ وہ بیٹے کی جدائی برداشت نہیں کر پائیں آخر کار اس سے جا ملیں۔

بلا تامل ان ناواجب حوادث کے لیے ارفع کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ..... سبز قدم اور نہ جانے کون کونسے القاب سے نوازدیا گیا۔ ایک تو بیوگی کا دائمی رنج وغم اوپر سے لعن طعن کی بھرمار، بے چاری کا برا حال تھا۔ جب تک شوہر کا پیار اور حقیقی ماں جیسی ہستی کے مہربان آنچل کا سایہ میسر تھا اس کی زندگی مانو پھولوں کی سیج بنی ہوئی تھی ان کے آنکھیں موندتے ہی خارزار میں تبدیل ہو گئی۔ اپنوں کے منہ سے ہمدردی کے دو بول سننے کے لیے اس کے کان ترس کر رہ گئے۔ ساری دنیا میں ایک بھائی کے علاوہ کوئی اس کا ہمدرد وحامی نہیں رہا۔

ماں کے جنت آشیانی ہوتے ہی تینوں بہنوں نے وہ رنگ دکھایا کہ ارفع کو دم بخود رہ جانا پڑا۔ یہ جتاتے ہوئے کہ ماں کے ورثہ پر صرف بیٹی کا حق ہوتا ہے گھر کی تمام اشیا پر اپنی ملکیت ثابت کر دی۔ رافیعہ بیگم کی نجی املاک...... ہیرے موتی جڑے بیش قیمت گہنے، قیمتی جوڑے، جوتیاں، مصنوعات، نماز کی چوکی سمیت سارا فرنیچر حتیٰ کہ کمرے میں موجود خس وخاشاک بھی نہ چھوڑا۔ تبرک کے نام پر سب کچھ اٹھا لے گئیں۔ بیش قیمت اشیا پر خود ہاتھ صاف کیا۔ میانہ درجے کی حامل اشیا کو گھر کے نوکروں اور نادار اقربا میں تقسیم کر دیا۔ بقول ان کے ارفع نہ ان چیزوں کی حقدار ٹھہرتی تھی اور نہ ان کی قدر وقیمت ہی جانتی تھی۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اپنی ماں کی میراث سے ایک تنکا بھی اس کے ہاتھ نہ لگنے دیں گی۔ علاوہ ازیں باہم تہیہ کیے ہوئے تھیں کہ اس منحوس خاندان ہستی سے آئندہ کوئی تعلق نہیں رکھیں گی۔

ارفع کو نہ صرف اس گھر کے درودیوار بلکہ ہر ایک شے سے چاہت اور عقیدت تھی کیونکہ اس کی زندگی کی حسین ورومان پرور یادیں ان سے

منسلک تھیں۔ جان چھڑکنے والا شوہر اور حقیقی ماں جیسی شفیق ساس کے گزر جانے کے بعد ان کی نشانیاں ہی تو اس کا کل سرمایہ تھیں۔ اگر وہ چاہتی تو بڑی آسانی کے ساتھ کل میراث کے جائز حقدار کی ملکیت ثابت کر سکتی تھی جو آئندہ کچھ ماہ کے اندر اس دنیا میں آنے والا تھا لیکن اس کے دل میں ان مادی اشیا سے کہیں زیادہ انسانی رشتوں کا پاس اور لحاظ تھا۔ اسے یاد تھا کہ مشرف کے دل میں اپنی بڑی بہنوں کے لیے بہت قدر و منزلت رہی تھی۔ بیوی کو ہمیشہ تاکید کرتا رہا تھا کہ بڑے بزرگوں کا احترام کرے اور ان کے آگے اپنی زبان نہ کھولے۔ بس اس نے اپنے لب سی لیے اور سب کچھ مشیت ایزدی پر چھوڑ دیا۔ اس کے بھائی ہمایوں نے بھی یہی گزارش کی کہ خاموشی اختیار کرے کیونکہ لاکھ کوشش کرنے کے باوجود منقولہ جائداد ہتھیانے کے علاوہ وہ اور کوئی نقصان پہنچانے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔

جب ان تینوں بہنوں پر منکشف ہوا کہ ارفع کے بطن میں خاندان کی آخری نشانی پل رہی ہے تو شکست خوردہ ہو کر رہ گئیں۔ چونکہ مکان مشرف کے نام تھا اس لیے پر اعتماد تھیں کہ اگر ارفع کے لڑکی ہوئی تو مکان میں اپنی حصہ داری ثابت کرنے کا موقع ملے گا پھر پتہ چلا کہ مشرف نے جانے کب مکان ارفع کے نام کر دیا ہے۔ ان کے مطابق اس میں بھی ضرور ارفع کا ہاتھ تھا ورنہ بھائی سے ایسی توقع قطعی نہیں کی جا سکتی تھی۔ حقیقتِ حال سے باخبر ہوتے ہی ہمایوں اپنی بہن کی حمایت میں کھل کر سامنے آ گیا۔ اعلان کر دیا کہ اگر آئندہ کسی نے تخریبی ارادوں کے تحت مکان کے اندر قدم رکھنے کی جرات کی تو اسے مجبوراً قانون کا سہارا لینا پڑے گا اور اب تک جو زیادتی اس کے ساتھ ہوئی ہے اس کا پورا بدلہ لے کر رہے گا۔

قدرت کے کھیل بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ انصاف قائم کرنے کا اس کا اپنا نرالا طریقہ کار ہوتا ہے جو عوام الناس کے فہم و ادراک میں نہیں آ سکتا۔ ارفع اور مشرف کی بیٹی ہو بہو رافعہ بیگم کی تصویر تھی۔ سر تا قدم اس قدر مشابہت تھی گویا ان کا دوسرا جنم ہوا ہو۔ تینوں بہنیں انگشت بدنداں تھیں۔ جسے کلی طور پر وراثت سے محروم کرنے کی بے رحمانہ سازشیں کی تھیں قدرت نے اس کے منہ توڑ جواب میں صحیح حقدار کو گویا اپنے ہاتھوں سے موروثی نشانیوں سے آراستہ و پیراستہ کر کے دنیا میں وارد کر دیا تھا۔ یہ بے مثال رنگ روپ نہ بیٹیوں کو ملا تھا اور نہ ان کی اولاد میں کسی ایک کے حصے میں آیا تھا۔ پوتی نے اپنی دادی کے قابل تعریف اور خوبصورت نین نقش ورثہ میں پا لیے تھے۔

بچی کی خوشنما شبیہ تینوں لڑکیوں کو اپنی ماں کی یاد دلا گئی۔ فرطِ جذبات سے آبدیدہ ہو گئیں ساتھ ہی احساسِ جرم کے زیر اثر ان کے دل خوف و دہشت سے بھر گئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے سب کی خبر گیری کرنے کے لیے ان کی امی لوٹ آئی ہوں۔ بے اختیار آگے بڑھ کر بچی کے پیروں کو چوم لیا پھر عقیدت کے ساتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ جی چاہتا تھا کہ رافعہ بیگم کی تصویر کو ایک پل کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ ترکِ تعلق کا خیال نہ جانے کہاں ہوا ہو گیا۔

ارفع جب رو بہ صحت ہو کر اسپتال سے لوٹی تو گھر کی کایا پلٹ کو ملاحظہ کر کے متحیر رہ گئی۔ رافعہ بیگم کے بند کمرے کو فرش فروش سے درست کر کے ان کی پوتی کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ وسیع و عریض کمرے کی شان و شوکت پھر سے بحال ہو گئی تھی۔ قالین، مسہری، الماریاں اور دوسری تمام ضروری چیزیں جوں کی توں اپنی جگہ رکھی ہوئی ملیں گویا انہیں یہاں سے کبھی ہٹایا ہی نہیں گیا تھا۔ مرحومہ کی دیگر یادگار اور قیمتی اشیا بھی جو اچانک غائب ہو گئی تھیں رفتہ رفتہ ایک ایک کر کے وارد ہونے لگیں۔

Prof. Shahida Shaheen
371, 6th Cross,
Opp. Nehru Park,Udayagiri
Mysuru-570019 (Karnataka)

فرہنگ آصفیہ سے

ابجد ۔ ع ۔ اسم مذکر ۔ الف ۔ بے تے ۔ حروفِ تہجی ۔

(ابجدیں دو ہیں ۔ ایک آدم علیہ السلام کی ترتیب دی ہوئی دوسری حضرت ادریس علیہ السلام کی ۔ چنانچہ آج کل ادریس ﷺ ہی کی ابجد جاری ہے ۔ انہوں نے اسی ابجد کو ترتیب دیکر آٹھ بامعنی کلمے بنائے اور ابجدِ ادریس اس کا نام رکھا ۔ اس ابجد میں عربی کے تمام حروف آگئے ہیں ۔ اگر انہیں علیحدہ کر کے ترتیب دیا جائے تو پوری الف بے تے بن جائے ۔ ان حرفوں کے اعداد بھی مقرر کئے ہیں جنہیں حساب جمل کہتے ہیں ان کی یادداشت عربی ۔ فارسی ۔ اردو کی تاریخہائے سنین تعمیر و سنین اسماء اور معموں میں بڑی مدد دیتی ہے ۔ بعض لوگ بچوں کے نام بھی اس قاعدہ سے ایسے رکھتے ہیں کہ جس سے ان کی پیدائش کا برس نکلتا ہے چنانچہ ہمارے فرزند جگر بند سعید احمد ﷺ عرف دن بار احمد منصبدار حضور نظام کا تاریخی نام بھی سید مظہر علی ہے ۔ جس سے اس کی پیدائش کا سنہ یعنی ۔ ہجری برآمد ہوتا ہے ۔

ابجد ادریس کے آٹھوں کلمے یہ ہیں ۔ ابجد ۱ ۔ ہوز ۲ ۔ حطی ۳ ۔ کلمن ۴ ۔ سعفص ۵ ۔ قرشت ۶ ۔ ثخذ ۷ ۔ ضظغ ۸ ۔

زیب النساء حیا

روح ایک پرندہ ہے

کہتے ہیں نہ حویلیاں ماضی کا وہ آئینہ ہوتی ہیں جن میں یادوں کے لمحے عکس بن کر ہر پل احساس کراتے ہیں انسان کا وجود بھلے ہی نہ رہے مگر اس کے نقوش نہیں مٹا کرتے، حویلیاں بھلے ہی کھنڈر کا روپ اختیار کر لیں مگر پھر بھی وہ پرندوں کو پناہ دیتی ہیں اور پرندے وہاں آشیانہ بنا کر بڑے سکون سے جیتے ہیں اور دل ہی دل میں جانے والوں کے لیے دعا کرتے ہوں گے کہ آج انھیں کی وجہ سے انھیں یہ پناہ گاہ ملی۔

بہر حال ہر حویلی کی اپنی ہی داستان ہوا کرتی ہے کہیں گلشن تو کہیں ویرانی، ان خاموش حویلیوں میں کہیں نہ کہیں کوئی اپنی ہی کہانی انسان سے اپنا تعارف کرواتے کو آ وبھرتی نظر آ ہی جاتی ہے۔ حویلی کی بات چھڑی تو ناگہانی ہماری یادوں میں بھولی بسری منا آ گئی۔ جی ہاں یہ وہی منا ہے جو سچ کی زمین پر ایک سچا سا کردار جس نے اپنے اخلاق سے یہ ثابت کر دکھایا تھا اپنے لیے تو سب جیتے ہیں بات تو تب ہے جب دوسروں کے لیے جئیں۔ اس بات کی تصدیق ان کی وہ حویلی ہے شہر سے دور ایک بہت بڑی حویلی میں رہا کرتی تھی۔ جب بھی میرا گزر اس حویلی کی طرف سے ہوتا منا آپا سے سلام دعا ضرور ہوتی۔ اس دن بھی یہی ہوا صبح نماز کے لیے گھر سے نکلا، تو سوچا کیوں نہ آج بعد نماز آپا جان سے کچھ دیر گفتگو کی جائے، ویسے بھی سنڈے کا دن تھا، روز آنا وہی ڈھیروں۔ مصروفیات رہتی، سو یہی سوچ کر میرے قدم اب حویلی کی جانب بڑھے، ابھی گیٹ تک ہی پہنچا تھا، میرے کانوں میں منا آپا کی آواز آئی، واہ رے، کیا خوب صلہ دیا تو نے کسی مظلوم پر رحم نہ کیا۔ کیا یہی ہے میری صلہ رحمی کا انجام...... بیچارے اس ننھی سی جان کو اپنا نوالہ بنانے کی خاطر اسے گھونسلے سے گرا دیا۔ کیا اچھا ہوتا کہ میں تجھے کھانا ہی نہ دیتی۔ اور پھر ایک پل کے لیے خاموشی چھا گئی۔ میں گیٹ کے اندر داخل ہوا کیا دیکھا منا آپا کی ناراضگی ایک چیل پر تھی جو سامنے کی دیوار پر بیٹھی انھیں ہی دیکھ رہی تھی۔ انھوں نے جس مظلوم کے لیے سراپا شور کو سر پر اٹھا رکھا تھا وہ کوئی اور نہیں انھیں کے باغیچے میں لگے آم کے درخت پر رہنے والا ایک ننھا منا چڑیا کا بچہ تھا جس کو وہ پیار سے نینو بلاتی تھی۔ نینو ان کی تنہائیوں کا ساتھی تھا، اکثر وہ اس سے ہی باتیں کر کے دل بہلا لیا کرتی تھی۔ مگر آج نظارہ ہی بڑا عجب غضب تھا نینو زخمی حالت میں اپنے ٹوٹے پنکھوں کے ساتھ زمین پر پڑا تھا اور ادھر منا آپا اس کی تیمارداری کی خاطر خادمہ کو بلا کر حکم دے رہی تھیں، جلدی سے میرا first aid-box لے کر آؤ، اس پل وہاں کا منظر جتنا دلکش تھا اس سے کہیں زیادہ ذہن پر اثر چھوڑنے والا بھی تھا، میں وہیں کھڑا سوچنے لگا، یہ تو سنا تھا انسانیت کا دوسرا نام محبت ہے مگر آج دیکھ لیا، منا آپا کی محبت صلہ رحمی ایک ننھے سے پرندے کے لیے۔ ابھی میں سوچ میں ہی ڈوبا تھا اچانک منا آپا کی آواز سے چونکا ارے بھئی امین اندر آؤ نا، وہاں کیوں کھڑے ہو، جی آپا جان، یہ کہتے اب میں ان کے سامنے کھڑا تھا۔

آج سویرے کیسے آنا ہوا؟ منا آپا نے پوچھا تو میں نے بس اتنا ہی کہا، بس یوں ہی آج دل نے کہا کیوں نہ آپ کے باغیچے کی تازہ ہوا کھائی جائے۔ یہ کہتے ہوئے امین نے گہری سانس لی۔ امین کی بات سن کے منا آپا تھوڑا ناراضگی بھرے لہجے میں بولی، ارے بھئی چھٹی کے دن کا انتظار کرنا کیا ضروری تھا؟ آپ کہتے ہو تو کیا ایک بھائی کو اپنی بہن کے گھر آنے کے لیے اجازت لینی پڑتی ہے۔ یہ کیا احمقانہ بات ہے امین......!! اچھا۔۔ چلو اب یہ بتاؤ چائے پیو گے یا ٹھنڈا، اس پر امین بولا، چائے!

چائے۔۔۔ ناشتے کے بعد شروع ہوا باتوں کا سلسلہ تو میں نے ہی بات چھیڑی، ”آپا۔ جان آپ اتنی بڑی حویلی میں اکیلی کیسے رہ لیتی ہیں؟ کبھی دل نہیں گھبراتا آپ کا؟ میرے اس سوال پر پہلے تو وہ کچھ دیر خاموش

رہیں پھر ایک دم بولی، کون کہتا ہے میں تنہا ہوں کیا تم نہیں جانتے اللہ تعالیٰ کہتا ہے: 'میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں اور جب وہ مجھے پکارتا ہے، تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔' ان کی یہ بات سن کر میں لاجواب ہو گیا۔.......... پہنچا تو معلوم ہوا، میرے تبادلے کا آرڈر آیا ہوا ہے۔ آناً فاناً میں، میں نے جانے کی تیاری شروع کی، اور پھر منا آپا سے ملنے پہنچا، دیکھا وہ عبادت میں مشغول ہیں کچھ دیر بعد جیسے ہی وہ دعا سے فارغ ہوئی، مجھے دیکھتے ہی بولی، دیکھا مجھے تنہائی کیوں نہیں محسوس ہوتی، جب رب کی یاد میں انسان دنیا سے غافل ہو جاتا ہے تب کیا تنہائی، کون اپنا کون پرایا، بے معنی باتوں سے کوئی سروکار نہیں رہتا انسان کو، ان کی بات سن کر میں دل ہی دل میں کہہ اٹھا، خدا کے ذکر سے قائم ہے یہ نظام حیات، یہ دل دھڑکنے کی ہر وقت صدا دیتی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اب میں نے منا آپا کو اپنے سفر کے بارے میں بتایا تو وہ بھیگی آنکھوں سے بولی، بھلے ہی امین تمہارا میرا خون کا رشتہ نہیں تھا، مگر آج تمہاری جدائی کا احساس ہو رہا ہے، جیسے خون کے رشتوں سے زیادہ اٹوٹ کبھی کبھی جذبات کے رشتے ہوا کرتے ہیں۔ بس ایک التجا ہے تم سے، میری رخصت روح کو کاندھا دینے ضرور آنا۔ اس روز ہم نے ایک دوسرے کو الوداع کہہ تو دی تھی، مگر وقت کی ستم گری دیکھئے میں انھیں ہر روز یاد کرتا تھا۔ وجہ ان کی شخصیت دوسروں سے بہت مختلف تھی۔ وقت پنکھ لگا کر اڑ رہا تھا اور پھر ایک دن اچانک مجھے خبر ملی، منا آپا اس دنیا میں نہیں رہیں اس وقت نہ پوچھئے میرا حال دل یوں لگ رہا تھا مانو میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا ہو۔ اگلے ہی دن میں حیدرآباد کے لیے روانہ ہوا۔ اور اب جیسے ہی میں ان کی حویلی کے قریب پہنچا ایک پل کے لیے مانو میری آنکھوں کو یقین نہ ہوا۔ حویلی کو سامنے ایک بورڈ لگا تھا۔ جس پر لکھا تھا 'اپنا گھر' یعنی منا آپا اب اس حویلی کو بے سہاروں کی پناہ گاہ بنا کر چلی گئی تھیں۔ افسوس ایک بات کا رہا کہ میں ان کے جنازے کو کاندھا نہ دے سکا۔ تھکے قدموں سے گھر لوٹا اور پھر اس رات جو میں نے خواب دیکھا اس کی تعبیر میں آج تک نہ جان سکا۔ میں نے دیکھا، سفید لباس میں کھڑی منا آپا مجھ سے کہہ رہی ہیں، تم یقیناً حیران ہو گے، کہ حویلی کو میں نے پناہ گاہ میں کیوں تبدیل کیا؟؟ تو سنو جب خود غرضی کی چادر اوڑھی، تبھی سے میری زندگی میں درد کی بدلی چھائی اتنا ہی نہیں ایک درد اور تھا، جس کا نام ایمر تھا، جو سفید گنبد کے نیچے سدا کے لیے خاموشی سے گہری نیند سو گیا، اور مجھے دے گیا عمر بھر کا انتظار۔۔۔ اور ویسے بھی سچ ہی تو ہے، 'شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے، دل ٹوٹے آواز نہ آئے۔'

میں نے عمر بھر تنہائیوں کو دوست بنایا اور پھر اس دن اچانک جب اس چیل نے ننھے چڑیا کے بچے کو اپنا نوالہ بنانا چاہا، تبھی مجھے خیال آیا دنیا میں کتنے ہی مظلوم بے سہارا ایسے ہوں گے جن کے سر کے نیچے چھت نہیں ہوگی۔ یہی احساس تھا جس نے حویلی کو 'اپنا گھر' کے روپ میں تبدیل کروا دیا۔ ویسے بھی حویلی میں رہنے والی روحیں جب پرواز کر جاتی ہیں، تو انھیں کیوں نہیں رہتا یاد۔۔۔ اور جائے دنیا کو کوئی سوغات۔ امین ہم سب بھی تو اس جہاں کے مسافر جان ٹھہرے، پھر کیوں بے زبان چیزوں سے محبت۔ ہاں آپ نے سچ کہا، یہ دنیا فانی ہے۔ یہ کہتے ہوئے امین یادوں کے دریچوں سے لوٹا اور دل ہی دل میں بولا، سچ کہا منا آپا آپ نے یہ سوچتے ہوئے وہ جیسے ہی آگے بڑھا اچانک اس کے کانوں میں آواز آئی۔۔۔ اتنا سنتا تھا امین دل ہی دل میں کہہ اٹھا، کاش! آپا آج آپ بھی ہمارے ساتھ ہوتیں۔

Zaibun Nisa Haya
A-1, 4th Floor, M.M Apartment
Near Shiya Masjid
Okhla Vihar- New Delhi-110025

فرہنگ آصفیہ سے

اَبرَق۔ ع۔ اَبْرَک۔ ف۔ اِسم مذکر + س (ابھرک) ایک کانی چمکدار جوہر ہے جو پیاز کی طرح پرت در پرت پہاڑوں کے نیچے سے نکلا کرتا ہے جب اسے صاف کرتے ہیں تو اس کے بڑے بڑے ورق بالکل آئینہ کے مانند ہو جاتے ہیں۔ ابرق آگ میں رکھنے سے نہیں جلتا۔ البتہ برق آگ اس کو جلا سکتی ہے۔ سنار لوگ چھوٹے چھوٹے زیور اس پر رکھ کر جھالتے ہیں۔ ہندی میں اسے بھوڈل اور چلچل، سنسکرت میں ابھرک فارسی میں ستارۂ زمین و ابرک کہتے ہیں ابرک کے کنول اور جھاڑ بھی بنائے جاتے ہیں۔ گنوار بھومل کہتے ہیں۔ مزاجاً اول درجے میں خشک دوسرے میں سرد تیسرے میں خشک ہے ابرق امراض ذیل کے واسطے دیگر اجزاء کے ساتھ مفید ہے جذام۔ جریان۔ سرسام۔ آنولہو۔ تپ محرق۔ سنگ گردہ و مثانہ اور سل وغیرہ۔ اس کا کشتہ کھانسی۔ دمہ۔ نزلہ۔ ضیق النفس اور دماغ کے لئے بھی نافع ہے اور اس کا طلا۔ زخم سینہ اور درد پستان کے لئے زیادہ فائدہ بخش مانا گیا ہے۔)

افسانہ

اڑیہ: ڈاکٹر پرتبھا رائے
اردو: رقیہ جمال

لمحے اور خواہشات

مگر لمحے بڑے ہی بے وفا ہوتے ہیں۔ پاس ہوں تو اپنے سے لگتے ہیں اور ہاتھ سے ایک بار پھسل جائیں تو بالکل پرائے ہو جاتے ہیں۔ اور خواہشیں وہ تو کسی چلبلی حسینہ کی طرح ہوتی ہیں۔ اندر کچھ باہر کچھ۔

زندگی انھیں لمحوں اور خواہشوں کے بیچ گردش کرتی رہتی ہے۔ آہ کاش! گزرے ہوئے لمحے لوٹ کر آ جاتے اور کاش یہ خواہشات حقیقت بن جاتیں۔

لمحوں اور خواہشوں کے دوش پر سوار میں اور سنگھ مدرا 'باگھ بکری' کا کھیل کھیلتے کھیلتے جوان ہو چکے تھے اور آج تقریباً پانچ سال کے بعد بے حساب گزرے ہوئے لمحوں کے بعد میری ملاقات سنگھ مدرا سے ہوئی۔

لیکن جس دبلی پتلی سنگھ کی طرح سفید سندری لڑکی کو سب سکھی بلاتے تھے وہ یہ تو نہیں تھی۔ بلکہ یہ تو بے پناہ دولت کے مالک مشہور انڈسٹریلیسٹ گیان بھدر کی بیوی سنگھ مدرا تھی۔ وہ سکھی ایک مہذب خاندان کی پانچویں بیٹی تھی۔ شرمیلی سی، معصوم سی، سیدھی سادی جسے سب سکھی بلاتے تھے۔ اور یہ ہے دولت کے نشے میں چور امیرانہ شان و شوکت کا دکھاوا کرنے والی گھمنڈی سی سنگھ مدرا۔ اس کا دونوں روپ میرے سامنے ان سلجھی پہیلی کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

اس دن میں سکھی کو سمجھ نہیں پایا تھا......

اور آج میں سنگھ مدرا کو سمجھ نہیں پا رہا ہوں......

میرے سامنے جو سکھی ہمیشہ اپنی نظریں جھکائے صرف ہاں اور نا میں جواب دیتی تھی بات بات میں شرما کر جس کی زبان لڑکھڑا جاتی تھی، ذرا سی سختی پر گھبرا جانے والی جو ہمیشہ میرے سامنے باادب، باسلیقہ، سمٹی سی، سر کو جھکائے ہوئے مطالعہ میں غرق رہنے والی لڑکی یہ تو نہیں تھی۔ بلکہ آج میں خود سنگھ مدرا کے سامنے شرمندہ سا ٹوٹا بکھرا ہوا سا محسوس کر رہا تھا۔ سنگھ مدرا کا زر و زیور سے آراستہ، دولت کی نمائش کرتا ہوا قیمتی ملبوسات سے لیس بھڑکتے بدن کو میں برداشت نہیں کر رہا ہوں۔

سنگھ مدرا کی بے تحاشہ خود پرستی، اپنے شریک حیات کی بے پناہ محبت کا بیان، دولت و شہرت کی نمائش، جاہ و جلال کی کہانی اس کی زبانی میں سن سن کر دنگ رہ گیا تھا۔ تب سکھی خوبرو تو تھی مگر پری چہرہ نہیں تھی۔ تب اس کے پر نہ تھے۔ گیان بھدر سے شادی کر کے سنگھ مدرا مانو پری بن گئی تھی۔ اس کے بدن پہ دولت و حشمت کے پر لگ چکے تھے۔ وہ اُڑ رہی تھی۔ اُڑتے اُڑتے وہ اونچا فاصلہ طے کر چکی تھی اور میں نیچے آ گیا ہوں۔ پھر بھی میں اس کو چھو نہیں سکتا۔ گیان بھدر کے دولت و شہرت کے سمندر میں سنگھ مدرا غوطہ لگا رہی تھی۔

سوچتا ہوں شادی کر کے پچھلے پانچ برسوں کے درمیان میں نے ایک بار بھی اس طرح چین و آسودگی کی زندگی نہیں گزاری۔ آسودگی کیا ہے؟ انسان کیا چاہتا ہے؟ آخر میں نے کیا پایا ہے؟ فلسفیانہ سوالوں کے یلغار سے اپنے ضمیر کو بوجھ کر کے میں لمحوں کو ضائع کر رہا تھا۔

حالانکہ میرا دل کہہ رہا تھا کہ سنگھ مدرا اپنی زندگی میں ہو سکتا ہے کہ خوش نہ ہو۔ میری طرح سب کچھ پا لینے کے باوجود بھی کچھ کھونے کا غم اندر ہی اندر ستا رہا ہوگا۔ پر میں ایسا کیوں سوچ رہا تھا۔ ان سوالوں کے پیچھے کیا منطق ہو سکتا ہے؟ ماضی میں سنگھ مدرا نے کبھی بھی مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھا نہیں تھا۔ کبھی بھی اس نے اپنی زبان سے عشق کا اقرار نہیں کیا تھا۔ کبھی میرے قرب کی خواہش نہیں کی تھی۔ میرے چہرے پہ مرکوز اس کی آنکھیں سبق سمجھتے سمجھتے کبھی کبھی اس کی نظریں کھڑکی کی حد پھلانگتے ہوئے نیلگوں آسمان میں کہیں کھو جاتی تھیں۔

اس دنیا کو چھوڑ کر وہ کسی اور دنیا میں مگن ہو جاتی تھی۔ میں رازدارانہ انداز سے کہتا۔

سکھی تم پڑھائی چھوڑ کر کہاں جا پہنچی ہو......

وہ چونک کر گھبرا جاتی۔ پسینے میں اس کا جسم شرابور ہو جاتا۔ میرا دل کہتا سکھ مدرا کسی سے پیار کرتی ہوگی۔ پیار کرنے کے سارے آثار اس کے چہرے سے عیاں تھے۔ میں بھی دل ہی دل میں اس کے محبوب کی جگہ خود کو رکھ کر بے قابو ہو رہا تھا۔ مگر کبھی بھی میں اپنی اس کمزوری کو اس پر ظاہر ہونے نہیں دیتا تھا۔ میں پیار کے اظہار سے ہچکچا رہا تھا۔ کاش میں اس کا محبوب ہوتا۔ سکھ مدرا بے حد خوب صورت تھی۔ کیا وہ مجھے اپنے قابل سوچتی نہیں ہوگی۔ یا پھر اس کے دل کی ان کہی بات کے اظہار تک مجھے انتظار کرنا ہوگا۔

موقع دیکھ کر ایک دن میں اس سے پوچھ ہی بیٹھا۔ 'سکھی۔ تم کس کو چاہتی ہو......؟'

'کسی اور کو نہیں۔' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

کسی اور کو کیا؟ (میں سوچ رہا تھا اس کا جواب ہوگا......تم سے)

مگر اس نے کہا۔ 'نئے سرے سے کسی اور کو نہیں......جس سے پہلے پیار کرتی تھی اس سے......'

مجھے شک کے تنگ دائرے میں تنہا چھوڑ کر وہ جا چکی تھی۔ اس کی بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ اس کا دوبارہ امتحان لینے کی میں نے پھر سے کوشش کی۔

'سکھی میری شادی بہت جلد ہونے جا رہی ہے۔ میرے لیے بہت سارے اچھے اچھے رشتے آ رہے ہیں۔ خوب صورت لڑکیوں کی تصویریں میرے پاس جمع ہو رہی ہیں۔'

(سوچا تھا جذبہ عشق سے اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں گی۔ چیخ چیخ کر کہہ اٹھے گی۔ نہیں ایسا ہو نہیں سکتا۔ میں صرف تم سے پیار کرتی ہوں۔ تم مجھے مایوس مت کرو)

مگر اس نے بڑی لاپروائی سے کہا۔

'ارے واہ! بہت خوب۔ بھابھی تو بہت خوبصورت ہوں گی اور جہیز بھی تو...... ہاں یہ تو اچھا ہوا نا......دعوت کب دے رہے ہو۔' اس نے بڑے تپاک سے پوچھا۔

میں نے لمبی سانس بھر کر کہا۔ 'تمھاری شادی کے بعد۔ اس لیے کہ مجھے میری شادی کی دعوت تمھیں کھلانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'

'خود غرض کہیں کے۔' وہ اٹھی اور چل دی۔ مجھے پھر سے ایک بار وہ شک کے گھیرے میں ڈال گئی۔

کیسی خود غرضی! میری دوسری جگہ شادی یا اس کو میری شادی پہ مدعو نہ کرنا۔

لیکن اس دن وہ آئی۔ شادی کی خوش خبری دینے کے لیے۔ بولی 'میری شادی طے ہونے پر ہے۔'

'کہاں پر؟ کس کے ساتھ؟' میں نے خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

'گیان بھدر چودھری۔ مشہور انڈسٹریالسٹ۔ ایک ہینڈسم اور دولت مند شخص ہے۔'

'واہ! کیا ہاتھ مارا ہے۔ تم واقعی قسمت کی دھنی ہو۔'

'کیوں نہ ہوتی۔ سب کیا چھوٹی ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں؟ غریبوں کی بیٹیوں کے نصیب نہیں کھلتے کیا۔؟'

اس کی باتوں کے وار سے میں گھائل ہو رہا تھا۔ وہ جانے انجانے میرے جذبات کو مجروح کر رہی تھی۔

واہ ری شادی کرنے کی کتنی جلدی ہے تمھیں۔ جو ہمیشہ شرم و حیا کی پتلی بنی پھرتی تھی، آج شادی کی بات پر اس کی زبان شہد ٹپکا رہی تھی۔

اچانک وہ سنجیدہ ہو گئی۔ اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں نم ہو گئیں۔

کہنے لگی۔ 'لڑکیوں کی زندگی میں شادی کی بڑی اہمیت ہے۔ اور گیان بھدر چودھری جیسی شخصیت، ہر لڑکی کی اولین پسند ہے۔'

'لڑکیوں کی قسمت میں جدائی، اس گاؤں کو، رشتے ناطوں کو اور سب کچھ چھوڑ کر ایک نیا سنسار بسانا ضروری ہے تو دیر کس بات کی ہے۔'

اس کو تسلی دینے کے لیے جب میں نے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا تو میرے ہاتھوں میں گرم گرم دو بوند اس کے آنسو گر پڑے......اور وہ لوٹ گئی۔

اس کے گرم آنسوؤں سے میرا سارا وجود پگھل رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا۔ شادی کے بعد سب کو پرایا کر جانے والی ایک کنواری لڑکی کے آنسو اور محبت میں گرفتار ایک محبوبہ کے آنسوؤں میں کیا فرق ہو سکتا ہے......

اپنی محبت کا اس سے اظہار کروں یا نہ کروں۔ ایسے ہی موقع کی تلاش میں ایک موقع کھو کر دوسرے کا انتظار کرتے کرتے اپنی انا کے کہرے میں لپٹا ہوا سکھ مدرا کی شادی میں دیوانوں کی طرح مگن ہو گیا۔

رخصتی کے وقت تک سکھ مدرا کے قریب رہتے ہوئے بھی اس نے مجھ پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی۔ اب وہ پوری طرح سے گیان بھدر کی ہو چکی تھی۔

آج پورے پانچ سال بعد وہ میرے روبرو تھی۔ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کے لیے پھر سے وہ اسی کالج میں ایم۔ اے کی طالبہ بننا چاہتی تھی۔ 'فلاسفی' کی پڑھائی میرے پاس پوری کرنے کے لیے اس نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا۔

تو کیا سکھ مدرا ساری ادھوری کہانیاں مکمل کرنے کا موقع فراہم کرے گی؟

سکھ مدرا مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ سے موتی جھڑ رہے تھے۔ اس کا اس دن کا کنوارہ پن آج بے حد حسین اور پرکشش لگ رہا تھا۔

اور وہ اصرار کر رہی تھی کہ میری مدد کے بناوہ پڑھائی مکمل نہیں کر سکتی۔ کیا وہ میرے بغیر مکمل نہیں ہے۔ لیکن آج میری مصروفیات اور فرائض اتنی زیادہ ہیں کہ اسی بھاگ دوڑ بھری زندگی میں کیا میں سکھ مدرا کے لیے کچھ گھنٹے نکال پاؤں گا؟ آخر اس میں میرا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟

میری الجھن دیکھ کر وہ کہنے لگی! ارے تم ہچکچا کیوں رہے ہو؟ بنا محنتانہ کے میں تمہارا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ اس وقت کی بات اور تھی۔ آج میرے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ۔ تمہارے حالات آج کچھ اور ہیں۔ تین کمزور بچے اور تم دونوں...... تمہاری تنخواہ کتنی ہے...... آج کل جو مہنگائی کی مار ہے تو بے۔ بھلا۔ چھ سات سو روپے کی کیا حقیقت...... وہ تو کہتے ہیں کہ بچارے لیکچرار حضرات دانشور طبقے سے تعلق رکھتے ہیں مگر کوئی فائدہ نہیں۔ مہینے کے آخر میں جتنی تنخواہ آتی ہے وہ تو میرے ایک دن کے پاکٹ خرچ سے بھی کم ہے۔ گویا سکھ مدرا نے یخ بستہ سرد موسم میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں سے میرے وجود کو سن کر دیا ہو۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ میرے ہاتھوں میں سو سو کے تین کرارے نوٹ تھما کر کہنے لگی۔ دیکھو تم منع مت کرنا۔ گرو دکھشنا کے بغیر تعلیم مکمل نہیں ہوتی۔ مفت میں پڑھ رہی تھی تو اس لیے میری پڑھائی ادھوری رہ گئی۔ سکھ مدرا جا چکی تھی۔ میں پھر سے الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ سکھ مدرا کا یہ گرو دکھشنا تھا یا میری غربت کا مذاق۔

قیمتی ملبوسات، زیورات، مہنگی گاڑی میں سوار ہو کر خوشبوؤں میں ڈوبی کالج روم کو معطر کرتی ہوئی سکھ مدرا پڑھائی کرنے کے لیے نمودار تو ہوئی مگر وہ مجھے اپنی مدہوش کر دینے والی ازدواجی زندگی کی کہانی سنا رہی تھی۔

اس کا یہ ظلم سہا نہیں جاتا۔ اس دن وہ مجھ سے مخاطب ہونے لگی۔ ارے تمہیں کیا ہوا۔ تمہاری صحت اتنی گر گئی ہے۔ سندری بھابھی کیا تمہاری صحت کا حساب کتاب اپنی ڈائری میں درج نہیں کرتیں۔ پھر ذرا سوچنے کے انداز میں گویا ہوئی۔ واقعی کہنے سے نہیں ہوتا۔ کتنی بھلا تمہاری تنخواہ ہے۔ کمزوری تو ہوگی ہی۔ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے وہ پھر سے بولی۔ تمہارا رنگ اگر تھوڑا سا اور صاف ہوتا میری طرح تو، میں اپنے بدن سے گوشت نوچ کر تمہارے بدن پر چھاپ دیتی۔ دیکھو نا چند دنوں میں میں کیا سے کیا ہو گئی ہوں۔ جتنا کم کھانے پر بھی بدن ہے کہ گھٹتا نہیں۔ ارے میرے 'ان' کو کون سمجھائے؟ ہر روز دودھ، پنیر، انڈے، پھلوں کے جوس لینا ضروری ہو گیا ہے۔ ان کے سامنے۔

میں پسینہ پسینہ ہو چکا تھا۔ سکھ مدرا کے طنز کے پیچھے کیا راز ہے۔ تو کیا سکھ مدرا مجھ سے محبت کرتی تھی؟ کیا آج بھی کرتی ہے؟ ناکام محبت کی آگ میں کیا وہ سونے کے محل میں جل رہی تھی؟

نہیں! اب اس کو مجھے اپنا پہلا اور آخری سوال پوچھ لینا چاہیے۔ کیا وہ مجھ سے محبت کرتی تھی؟ اب بھی کرتی ہے؟

اس دن ایک نئی خبر کے ہمراہ سکھ مدرا پھر سے میری منتظر تھی۔

تمہارے پاس میرا سب کچھ ادھورا رہ گیا۔ ہمیشہ کے لیے۔ اس نے بڑے تاسف سے کہا۔

مطلب......

مطلب۔ ہم امریکہ جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم وہاں کے شہری بن جائیں۔ ان کی یہی خواہش ہے۔

ہندوستان جیسے غریب ملک میں بھلا کیا رکھا ہے۔

وہ۔ تو۔ تمہاری پڑھائی پھر سے ادھوری رہ گئی۔

تو کیا کیا جا سکتا ہے۔ میری گرو دکھشنا سے لگتا ہے تم مطمئن نہیں ہو۔ سکھ مدرا کے طنز سے میں پھر سے لہولہان ہو گیا۔

صحیح کہا تم نے...... میں نے تم سے دولت کی خواہش کبھی نہیں کی تھی۔ اس لیے میں تم سے خفا ہوں کہ تمہاری پڑھائی ادھوری رہ گئی۔ تمہارے روپے تم واپس لے جاؤ۔ میں نے ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔

میں نے اس کے روپے الماری سے نکال کر اسے پکڑا دیے۔ وہ پہلے جیسے معصوم انداز سے کہنے لگی۔ گرو دکھشنا لو پر تمہاری ضروریات کے مدنظر اسے رکھنا کیا صحیح نہیں ہوگا۔

چند روپے دے کر میری ضروریات کو تم دور نہیں کر سکتی۔ سکھی۔ میں نے جارحانہ انداز سے کہا۔

ہوں۔ وہ ایک لمبی سانس بھر ان روپے کو اپنے پرس میں رکھتے ہوئے اٹھ کر کہنے لگی۔ میں اس بار جا رہی ہوں۔ گر تم کبھی امریکہ جاؤ تو ہم مل سکتے ہیں۔ ورنہ اس زندگی میں یہ آخری ملاقات ہوگی۔ امریکہ میں مگر زندگی خوب آرام دہ ہوتی ہے۔ عیش و عشرت سے بھری زندگی ناکام وہ مصنوعی ہوئے۔ بے ترتیب سانسوں کو قابو کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

کہنے لگی۔ واقعی گیان بھدر سے شادی کر کے میں بہت خوش ہوں۔ تم گویا تمہارے جیسے اور کسی سے شادی کرے بھلا کیا مل جاتا؟

اس کے آخری چابک کے وار سے میں گھائل ہوئے جا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر چلی گئی۔ جاتے سمے اس نے دوبارہ بھی مڑ کر نہیں دیکھا؟

سامنے لائٹ پوسٹ......اس کے نیچے میں نے بے ساختہ اس کی

دونوں بانہوں کو پکڑ کر میری طرف اس کو گھما کر کانپتے ہوئے آواز میں کہا۔ میرے پہلے اور آخری سوال کا جواب دے دو سکھی!

وہ میرے اچانک سوال کا جواب دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ خالی خالی نظروں سے میرے چہرے کو تکنے لگی۔ لیکن یہ کیا؟ اس کی آنکھوں سے جاری بے شمار آنسوؤں میں اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ حالانکہ اب تک اس کی آخری ہنسی کی جلترنگ میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس کے دونوں ہونٹ لرزتے جذبات کو قابو کرنے کی بے حد کوشش کر رہے تھے۔ تیز آندھی میں بے سہارا پتے کی طرح بالکل۔ لائٹ پوسٹ کی دودھیا روشنی اس کے بھیگے چہرے کو اور روشن کر رہی تھی۔

اچانک بارش کی پھوار میں بھیگے توری کے پیلے پھول چاندنی میں نہا کر لرز رہے تھے۔

میرے اچانک چھونے سے اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ پیچھے منہ پھیرتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔ معاف کرنا میرے سوالوں کا جواب اب میں پا چکا ہوں۔ میں ملزم کی طرح سر جھکائے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ اگر اس کے دل کی بات اس نے نہ کہی تو کیا میں نے اپنے دل کی بات اس سے کہی ہے۔ وہ بھی میری طرح آج 'انا' کی آگ میں جل رہی تھی۔ تاعمر جلے گی۔

کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ پیچھے سے کہنے لگی۔ تمہارا جواب تمہارے پالینے سے بات نہیں بنے گی۔ مجھے بھی اپنا جواب چاہیے۔ میرے پیچھے پیچھے اپنے سوال کا جواب پانے وہ آئی تھی۔

میں نے جب مڑ کر اس کو دیکھا تو وہ کہنے لگی۔ رہنے دو۔ مجھے میرا جواب مل چکا ہے۔ سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

اس کی باتوں سے میرا ہاتھ بے ساختہ اپنی آنکھوں سے مس کرنے لگا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں، جس کا مجھے احساس نہیں تھا۔ انجانے میں میں رو رہا تھا۔

اب ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے پوری طرح بے نقاب ہو چکے تھے۔ شرم، افسوس اور پچھتاوے کے عالم میں ہماری انا کی دیوار ڈھ چکی تھی۔ ہم بے جان ہو کر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ ہماری زبان پر الفاظ نہیں تھے۔

میں اچانک پاگل سا ہو گیا۔ میں نے اپنا مردانہ غرور، طنطنہ، معاشرتی، بندھن کے حدود توڑ کر اس کو پہلی بار اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس نے بھی میرے سینے سے لپٹ کر اپنی محبت کا ثبوت بے انتہا آنسوؤں سے دیا۔ میں نے پرجوش لہجہ میں کہا سکھی تم مجھے الزام نہیں دے سکتی۔ تاہی میں تمہیں۔ مگر آج کسی کا خوف نہیں ہے۔ آج سماج اور اس کے قائدے قانون بہت بدل چکے ہیں۔ ہم قانون کا سہارا لے کر کیوں نہ ایک ہو جائیں۔ گھٹ گھٹ کر مرنے سے یہ بہتر ہے۔ اور تم اس میں اور کوئی اڑچن پیدا مت کرو۔ میں جذباتی ہو کر اسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

مگر......وہ ایک جھٹکے کے ساتھ مجھ سے جدا ہو گئی۔ کٹھور نظروں سے دیکھتے ہوئے بلند آواز سے کہنے لگی۔ ساری باتیں قانون صحیح ہونے کے باوجود بھی حقیقت میں ممکن تو نہیں ہے نا۔ جن لمحوں کو ہم دونوں نے گنوا دیا ہے، جن خواہشوں کو ہم نے اپنی جھوٹی انا سماجی بندھن شرم وحیا کے چلتے برباد کیا ہے، اس کا انجام ہم دونوں کو ہی بھگتنا ہوگا۔ اس کا پرائسچیت صرف ہم دونوں کو کرنا چاہیے۔ اس کے لیے میرے شوہر اور تمہارے بیوی بچے کیوں ناکردہ گناہ کے مستحق ہوں۔ ان لوگوں کا بھلا ان سب میں کیا قصور۔

جن لمحوں میں جو کام بے حد آسانی سے ممکن ہوتے ہیں، اس وقت انسان کیوں کر وقت ضائع کرے۔ دوسرے لمحات میں بے تحاشا الجھنوں کا شکار کیوں بنے۔ آگ کی دریا میں ڈبکی لگانے کی ہمت کر کے پانچ نفوس کو اپنے لپیٹے میں لینے کی حماقت ہم کیوں کریں۔

میم صاحب! کیا گاڑی اسٹارٹ کروں؟

ڈرائیور با ادب بلا رہا ہے۔ (بندھن بلا رہا ہے)۔ فرض پاؤں میں بیڑیاں ڈال رہے ہیں۔

سکھ مدرا آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے آگے بڑھ جاتی ہے۔ وہ غموں کو پیروں سے گیند کی طرح اچھالتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ گویا وہ کہہ رہی تھی۔ جن لمحوں کو پیروں سے کچل دیا جائے وہ لمسیے وہیں ساکت ہو جاتے ہیں۔ پیچھے لوٹ کر نہیں آتے۔ بیتے لمحوں کو کھینچ کر آج میں لانے سے سب سے زیادہ آپ کے اپنے متاثر ہوتے ہیں۔ جن آوارہ چمگادڑ نما خواہشات نے لمحوں کے دوش پر آشیانہ بنایا تھا۔ ضمیر اور فرض کے احساس سے پھسل کر سکھ مدرا کی گاڑی کے پہیوں کے نیچے کچل کر سسک رہے تھے۔ مگر بے وفا لمسیے اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ داؤ پیچ سے بھرا 'باگھ بکری' کا کھیل ختم کر کے سکھ مدرا ہمیشہ کے لیے یہاں سے رخصت ہو رہی تھی۔

چمگادڑ نما خواہشات کو ضمیر کی چابک سے قابو پا کر میں بھی سکھ مدرا کی طرح بیتے لمحوں کو پیروں کے نیچے روند کر گیند کی طرح کھیلوں گا۔ ہماری خواہشات تاعمر ایسے ہی سسکتی رہیں گی۔ اور ہم ایسے ہی برہا کی آگ میں جلتے رہیں گے۔

(بشکریہ رہروان ادب، کولکاتا)

ٹوٹ گیا اِک تارا

تسنیم سلیم چھتاری

نہ جانے آج کیوں دھڑکن میرے دل کی نہیں رکتی

یہ آہٹ آپ کی تھی آپ گزرے تھے ابھی دل سے

کچھ دیر یونہی کھڑا رہا پھر شرارت سوجھی اور پانی کا گلاس میز پر سے اُٹھا کران کے منہ پر چھینٹا دیا۔

تڑپ کر انھوں نے گردن موڑی اور مجھے دیکھ کر ہنس دی۔ 'اچھا ٹھہر جاؤ بدلہ نہ لیا ہو تو.......... بہت شریر ہوتے جا رہے ہو۔'

'آہا آپ کتنا اچھا گاتی ہیں...... اُفوہ'

'واقعی؟'

'ہاں میں ڈرا تھا۔ کہ کہیں دھوبی گدھے کی تلاش میں ادھر نہ آ نکلے۔'

'تو ہماری آواز گدھے جیسی ہے۔' انھوں نے میرے منہ پر کشن دے مارا

'نہیں توبہ...... معاف کیجیے منہ سے یہی بات نکل گئی۔'

'ٹھہر جاؤ بدتمیز تمہارے لیے کھانے کی چیزیں رکھی تھیں اب ہرگز نہ دوں گی۔'

'کھل گئی قسمت...... آپ بھی کتنی اچھی ہیں۔'

'جی ہاں تب ہی تو یہ قدر ہوتی ہے'

کہہ تو رہا ہوں بھول کر منہ سے نکل گیا...... اب کھلائیے نا کیا ہے؟

...... پہلے آپ کبھی ایسی مہربان نہ تھیں...... کیسے میرا خیال آ گیا؟'

'جاوید صاحب کے لیے بنائے تھے...... چونکہ تمہاری پسند کے نکونے تھے اس لیے رکھ لیے۔'

'تو کیا بھائی جان یہاں آئے تھے؟' میں نے چونک کر پوچھا۔

'ہاں ابھی تو گئے ہیں تمہارے آنے سے دس منٹ پہلے!'

'آپ سے باتیں ہوئیں'

'ظاہر ہے ابا جان بھی یہاں موجود نہ تھے اور اماں کو تم جانتے ہو کہ وہ کتنی کم گو ہیں...... بیچارے جاوید صاحب چپکے ہی بیٹھے رہتے!'

'کیا کیا باتیں ہوئیں؟' میں یہ معلوم کرنے کو بیتاب ہو گیا۔

'وہ اپنے دورانِ تعلیم کی کچھ دلچسپ باتیں سناتے رہے۔'

نہ جانے کیوں میرا دل اداس ہو گیا...... شاید میں یہ چاہتا تھا کہ انجم کو سوائے میرے اور کسی کی باتیں دلچسپ نہ لگیں!

پھر کچھ ایسا ہوا کہ روز جب میں اسکول کی واپسی پر ان کے پاس جاتا تو وہ مجھے بتاتیں کہ ابھی جاوید صاحب یہاں سے گئے ہیں...... اور یہ بھی کہ اُن کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں...... انجم کا میرے ساتھ وہی سلوک تھا اسی طرح باتیں، چوٹوں کا معالجہ، کپڑوں کی درستی، مگر نہ جانے کیوں مجھے لگتا کہ وہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہیں...... کوئی ہمارے درمیان حائل ہو گیا ہے! کون؟ بھائی جان! مگر ہم دونوں ایک دوسرے کے رقیب تو نہیں ہو سکتے تھے! یہ باتیں اب سوچتا ہوں اس وقت تو ایک ہی خیال تھا کہ وہ مجھ سے نہ چھن جائیں...... اور بس!

اتوار کی صبح بھائی جان اور میں دونوں ایک ساتھ ان کے یہاں پہنچے باتوں باتوں میں گانے کا ذکر نکل آیا۔ میں نے کہا بھائی جان بہت اچھا گاتے ہیں۔ یہ بات سچ بھی تھی! انجم نے کہا کہ جاوید صاحب کو گانا سنانا پڑے گا۔ بھائی جان نے اول دو چار دفعہ معذرت کی پھر تیار ہو گئے!

گانا شروع کیا۔ 'کون سا گیت سنو گی انجم'

انجم نے کہا 'جو آپ سنائیں گے۔'

'کون سا گیت سنوگی انجم؟'
'کوئی سا بھی! گا یئے تو آخر'
'گا تو رہا ہوں' ۔ بھائی جان نے جواب دیا۔
'واہ یہ کوئی گانا ہے'
'ارے اور کیا...... یہ تو جاں نثار اختر کی نظم ہے'
'ہم نہیں سنتے...... کوئی ڈھنگ کی چیز سنائیے۔'
بھائی جان نے ایک غزل گائی جس کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے۔

شروع راہِ محبت ارے معاذ اللہ
یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

انجم ساکت بیٹھی سنتی رہیں! بعد میں تعریف کچھ اس طرح سے کی کہ بھائی جان کو بہت سی چیزیں گانی پڑیں۔

انجم کو بھائی جان کی آواز اتنی پسند آئی کہ اب وہ ہر ملاقات میں گانے کی فرمائش کرتیں۔ ان بہت سی ملاقاتوں میں سے جن میں شریک ہونے کا مجھے بہت کم موقع ملتا تھا۔

بھائی جان ہمیشہ اسی سے شروع کرتے

'کون سا گیت سنوگی انجم؟
گنگناتا سا فسانہ کوئی
یا محبت کا ترانہ کوئی
کیسے بنتا ہے نشانہ کوئی
کون سا گیت سنوگی انجم؟

اور آخر کار سب ہی طرح کے گیت سنا ڈالتے...... میں کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا...... بھائی جان کو یہاں آئے ایک مہینہ گزر گیا...... پہلے دن ان کا خیال تھا کہ دس پندرہ دن بھی نہ رہ سکیں گے اور اب انھوں نے بیماری کے نام سے ایک مہینے کی چھٹی بڑھوالی حالانکہ یہ بہت چھوٹا شہر تھا۔ جس میں اچھے ہوٹل اور عمدہ کلب! مگر بھائی جان خوش تھے اور انجم بھی......

اگر میں رنجیدہ تھا تو اس کی وجہ سے خود بھی باخبر نہ تھا پھر بھی...... اگر میں رنجیدہ تھا تو اس کی وجہ سے خود بھی باخبر نہ تھا پھر اس کا تذکرہ کس سے کرتا...... ہاں مگر دل پر ہر لمحہ ایک بوجھ سا رہتا اور روح جیسے تھک کر آنکھیں بند کرنا چاہتی ہو!

وقت کی رفتار کو میں نہ روکنا چاہتا تھا۔ اور پھر مشیت کو ان کھیلوں سے کیا ایسے نامکمل افسانوں کے خاکے بہت سے بکھرے پڑے رہتے ہیں...... اگر آنسو کسی لمحہ بھی نہ رکیں تو ان کا دل سے احترام ہی جاتا رہتا ہے۔

یوں ہی چپ چاپ وہ دوسرا مہینہ بھی بیت گیا۔
ابا جان نے کہا۔ 'جاوید تم نوکری پر کب جا رہے ہو۔'
'سمجھ میں نہیں آتا ابا جان'۔
'کیوں؟ چھٹی کون سی تاریخ سے ختم ہوتی ہے؟'
'مجھے آج وہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔'
'تو پھر تم کیوں نہیں گئے؟'
'سوچتا ہوں کہ اب خود جاؤں یا استعفیٰ بھیج دوں۔'
'استعفیٰ' ابان جان نے چونک کر پوچھا۔ اب نوکری کا ارادہ نہیں ہے؟'

'یہ نوکری کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ ابا جان...... پھر ہمارا افسر بڑا سخت ہے۔ بس ذرا ذرا سی بات پر...... اور سب سے بڑی مشکل یہ کہ وہاں مجھے اچھا کھانا نہیں ملتا...... آپ نے محسوس کیا کہ یہاں آ کر میری صحت کتنی سنبھل گئی ہے۔ اب چاہتا ہوں کچھ دن یہاں رہ کر آرام کروں۔'

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جہاں لے جا کر بھائی جان مجھے آدمی بنانا چاہتے تھے وہ جگہ ان کی نظر میں اب کیوں بے رنگ و بو ہو گئی ہے جہاں اچھے اچھے ہوٹل ہیں وہاں کھانا کیوں برا ملتا ہے جہاں اچھی انگلش فلمیں چلتی ہیں وہاں کیوں دل نہیں لگتا اور جس افسر کی وہ ہمیشہ تعریف لکھا کرتے تھے وہ اب برا کیوں ہو گیا ہے...... میں یہ سب جانتا تھا اور مجھے بھائی جان سے ہمدردی بھی تھی، ...... وہ میرے رقیب تو نہیں انھوں نے انجم کو میری طرف سے تو نہیں بدل ڈالا...... اور پھر وہ کیا جانیں کہ میں اداس رہتا ہوں!

میرے دل میں شدید آرزو پیدا ہوتی کہ کاش انجم کی بھائی جان کے ساتھ شادی ہو جائے! میں انھیں خود کوئی گیت نہ سنا سکا مگر زندگی بھر گیت سنتے تو دیکھتا رہوں گا...... اور کیا یہ میرے لیے بہت نہیں!

بھائی جان نے نوکری چھوڑ دی...... انجم سنتی رہتیں میں دیکھتا رہتا اور وہ گاتے رہتے!

کوئی فطرت کا بہاریں نغمہ؟ چاند تاروں کا خماریں نغمہ؟
یا شگوفوں کا نگاریں نغمہ؟ کون سا گیت سنوگی انجم؟

نغموں کا ایک تانا بانا سب بن کر ہمارے چاروں طرف پھیل گیا ایک طرف بھائی جان تھے مختار...... دوسری طرف میں تھا مجبور! بیچ میں انجم! ہمیشہ کی طرح مسکراتی ہوئی ایک کے حال سے غافل اور دوسرے کی باتوں سے باخبر! میں دن رات اس الجھن میں اپنے لیے سکون کی تلاش کرتا رہتا...... مگر میں چاہتا کیا تھا یہ مجھے آج بھی معلوم نہیں ہے!

ایک صبح جب ابا جان کسی ضروری کام سے ہفتہ بھر کے لیے باہر جا رہے تھے تو چچا جان کی علالت کا تار موصول ہوا..... ابا جان کو انتہائی ضروری کام تھا۔ انھوں نے بھائی جان سے کہا کہ تم آج ہی شام کو اپنے چچا کے پاس لکھنؤ چلے جاؤ اور ہفتہ بھر بعد میں جب میں وہاں پہنچوں تو تم واپس چلے آنا۔ بھائی جان اس خبر سے مضطرب ہو گئے مگر لاچار تھے اسی شام کو جانا پڑا! انجم سے ملنے گئے تو میں عمداً گھر پر رہ گیا میرا دل ہی نہ چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ جاؤں! واپس لوٹے تو کتنے افسردہ تھے! مجھے رحم آنے لگا..... بھائی جان کو اسٹیشن پہنچا کر میں نے سوچا کہ انجم کے پاس چلتا ہوں ان سے کہوں گا کہ بھائی ایک ہفتہ بعد ضرور آجائیں گے۔

ان کے یہاں پہنچا وہ اپنے پلنگ پر آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹی تھیں میری ہمت نہ ہوئی کہ ان کو آواز دوں! چپ چاپ لوٹ آیا۔

پھر دوسرے دن صبح کو باغ میں گیا! نومبر کی شروع تاریخیں تھیں اور صبح کے وقت خاصی ٹھنڈ ہوتی تھی مگر میں صبح کو باغ میں ضرور جاتا تھا اور وہ مجھے وہاں ضرور ملتی تھیں۔ سوچ رہا تھا کہ آج خدا جانے وہ موجود ہوں گی، یا نہیں مگر پہلی نظر میں ان کو حوض کے کنارے بیٹھا ہوا دیکھ لیا! حال چال پوچھنے کے بعد انھوں نے پہلا سوال کیا۔

'جاوید ایک ہفتہ بعد ضرور واپس آجائیں گے؟'

'ہاں ضرور'

'اچھا..... پھولوں کو ہاتھ نہ لگانا! سمجھے؟'

'سمجھ گیا۔'

انھوں نے پھول توڑے اور جب ایک گلاب کا پھول میرے کوٹ میں لگا کر واپس چلی گئیں تو میں نے سنگ مرمر کے چبوترہ پر بیٹھ کر محسوس کیا آج بہت دن بعد میری بے چین روح کو کسی نے لوریاں دے کر آرام کی نیند سلا دیا ہے..... اور میں بہت خوش ہوں!

ایک ہفتہ گزر گیا۔

'آج تمھارے بھائی جان کے آنے کا دن ہے؟'

'جی ہاں آج آجائیں گے!'

'تم اسٹیشن جاؤ گے۔'

'ضرور جاؤں گا۔'

'پھر ان کے ساتھ یہاں آؤ گے؟'

'ضرور آؤں گا۔'

میں شام کو گیا ضرور مگر بھائی جان کے ساتھ نہیں بلکہ تنہا! انجم کو یہ بتانے کہ چچا کی طبیعت بدستور خراب ہے بھائی جان ایک ہفتہ بعد آئیں گے۔ ایک ہفتہ!

یہ دوسرا ہفتہ ان کے چہرہ پر اداسی کا رنگ مل مل کر گزر گیا مگر بھائی جان پھر بھی نہیں آئے..... چچا کی طبیعت ابھی تک خراب تھی!

آخر کار ابا جان اماں کو لے کر وہاں چلے گئے اور میں یہاں تنہا رہ گیا۔ زیادہ وقت اسکول کے علاوہ انجم کے پاس گزارتا وہ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتیں اور ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو امڈ آتے..... میرا دل ڈوب جاتا..... بھائی جان لوٹ آئیں تو پھر بلا سے انجم کی یہ اداسی ساری کی ساری زندگی کے لیے مجھ پر مسلط ہو جائے! مگر ان کے آنسو! جیسے یہ میرا گناہ ہو۔ دو ڈھائی مہینے ایسے عجیب گزرے..... رکے رکے اور پھیکے پھیکے..... ابا جان لوٹ آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ چچا جان اچھی طرح سے ہیں اور اب میں جاؤں گا تو تمھاری ماں کو لے آؤں گا جاوید بھی تب ہی آئیں گے۔'

میں نے انجم کو جا کر بتایا۔' آجائیں تب کی بات ہے۔'

اور میں نے سوچا کہ آخر کیوں نہیں آئیں گے..... ضرور آئیں گے۔

ابا جان دوبارہ گئے واپسی کا جو دن بتا گئے تھے اس کا میں نے لمحہ لمحہ گن کر انتظار کیا۔ آج بھائی جان ضرور آجائیں گے۔

'دیکھو'

'مذاق نہیں ڈٹ کر ناشتہ کھلانا پڑے گا آپ کو۔'

'اچھا'

اسٹیشن پہنچا گاڑی لیٹ تھی اور مجھے جھنجلا آرہی تھی خدا خدا کر کے ریل آئی تو ابا جان تنہا اترے میں گھٹ کر رہ گیا۔

'بھائی جان اور اماں کہاں ہیں؟'

'وہیں ہیں'۔ ابا جان نے جواب دیا۔

'کیوں نہیں آئے'

'بس ہفتہ بھر بعد آنے والے ہیں..... جاوید تو انگلینڈ جا رہا ہے۔'

'ایں'۔ مجھے ابا جان کی بات کا اعتبار نہ آیا۔

'مذاق نہیں..... سارا انتظام ہو چکا ہفتہ بھر بعد تو یہاں آئے گا اور دو دن ٹھہر کر اپنا سامان لے کر چلا جائے گا۔'

'یہ کیا سوجھا'

'اس کو تو ایسی ہی نئی نئی سوجھتی ہے پہلے کہا نوکری کروں گا میں نے کہا تمھاری مرضی پھر استعفیٰ دے دیا میں نے اس پر اعتراض نہ کیا۔ اب بیٹھے بٹھائے تعلیم کا شوق ہوا تو ولایت چل دیے۔ مجھ کو تو اب خبر ہوئی جب

ان کا پاسپورٹ تک بن چکا ہے۔'

'آپ نے روکا نہیں۔' میں نے ابا جان سے پوچھا۔

'میں کیا روکتا وہ اس قدر خود مختار ہیں ان کو چاہیے تھا کہ اول مجھ سے اجازت لیتے ماں رو رو کر جان کا خون کر رہی تھی۔ مگر صاحب زادے نے قسم کھائی ہے کہ ولایت جا کر پڑھوں گا۔'

میں سکتے کے عالم میں گھر لوٹ آیا انجم کے پاس جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی یہ ولایت کا قصہ اگر وہ سنیں گی تو کیا کہیں گی......اف توبہ!

میں نے کوشش بھی کی تو وہاں نہ جا سکا......صبح کو باغ میں گیا۔

'جاوید نہ آئے تو آپ بھی چھپ گئے!'

'ابا جان نے کچھ کام بتا دیا تھا۔'

'تمھارے بھائی جان تو خیر اب کیا آئیں گے مگر خالہ جان کیوں نہیں آئیں؟'

'جناب شرط ہے اگر اگلے ہفتے سب نہ آ جائیں۔'

'بس جاؤ بھی۔' انجم نے ہونٹوں کو دانت سے کاٹتے ہوئے بھیگی بھیگی پلکیں میری طرف اٹھائیں......میں سر سے پیر تک لرز گیا!!

اور لاکھ کوشش کی مگر بھائی جان کے ولایت جانے کی بات نہ سنا سکا۔ جس دن پھر ان کے آنے کی خبر تھی اس دن مجھ کو علم تھا کہ وہ ضرور آ جائیں گے۔ مگر اس یقین میں کتنا دکھ اور غم تھا میں ہی جانتا ہوں وہ آئیں گے اور تیسرے دن چلے جائیں گے......ایسی جگہ جہاں سے واپسی کے لیے ہفتے نہیں گنے جاتے بلکہ برسوں کا شمار ہوتا ہے۔

بھائی جان ریل سے اترے

'آپ ولایت جا رہے ہیں؟' میں نے پوچھا۔

'ہاں۔'

'کیوں؟'

'پڑھنے۔'

'کیا پڑھنے؟'

'بس کچھ......محض ایک ولایتی ڈگری چاہیے!' اور وہ ہنسنے لگے۔

گھر آ کر انھوں نے سامان باندھنا شروع کر دیا مجھ سے انجم کے متعلق ایک بھی سوال نہ کیا اور نہ وہاں گئے میں بھی دم بخود بیٹھا رہا۔

اماں بہت دن کے بعد آئی تھیں اس لیے انجم کی والدہ ان سے ملنے کو آئیں اماں نے انھیں بتا دیا کہ جاوید پرسوں ولایت جا رہا ہے۔

میں بوکھلا گیا کہ اب یہ انجم سے جا کر کہہ دیں گی اور پھر نہ جانے کیا ہوگا! مجھے رہ رہ کر بھائی جان پر غصہ آ رہا تھا۔ اس طرح بنتے تھے کہ جیسے ان کو انجم سے بہت محبت ہے اور اب بلا وجہ ولایت جا رہے ہیں تو ان سے ملے تک نہیں......ان کی زندگی برباد کرنے کے یہ ذمہ دار ہیں ان کا کیا بگڑا انجم بجھ کر رہ جائیں گی اور میری دنیا پھیکی اور بے رس! کیا مجھے انجم سے محبت نہیں؟ اور میں ان کا دکھ خوشی سے برداشت کر سکوں گا۔ اس گہری سوچ نے دوسرے دن شام تک میرا پیچھا نہ چھوڑا اور میں ڈر کے مارے انجم کے پاس بھی تو نہ جا سکا نہ جانے ان کی کیا حالت ہوگی۔ بھائی جان کے سامان کی مکمل فہرست بنا کر میں کمرے میں گیا۔ جہاں وہ ادھر ادھر کی چھوٹی موٹی چیزیں چند بیگ میں بند کر رہے تھے۔ دروازے پر پہنچا تو مجھے سسکیوں کی آواز سنائی دی اور پھر کچھ الجھے ہوئے سے الفاظ! انجم وہاں موجود تھیں! میرے قدم رک گئے۔ کچھ دیر بعد بھائی جان کی آواز ع

'زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم'

بھائی جان کو اب بھی جاں نثار اختر کی کوئی نظم یاد آ گئی تھی۔ مگر انجم اس کا مطلب نہیں سمجھ سکیں۔

'تو پھر زندگی کیا ہے۔'؟

میں بھائی جان کا جواب سننے سے پہلے وہاں سے لوٹ آیا انجم کے آنسو بہتی آگ کی طرح میری رگوں میں گھل کر مجھے جھلسے دے رہے تھے۔

دوسرے دن صبح کو بھائی جان نے مجھ سے کہا کہ اسٹیشن جا کر گاڑی کا صحیح وقت معلوم کر آؤ۔ میں نے بمبئی جانے والی گاڑی کا وقت معلوم کیا جو رات کو ساڑھے دس بجے یہاں سے جاتی تھی اور پھر گھر کی طرف لوٹا تو انجم مجھے اپنے باغ کے پھاٹک پر مل گئیں۔

'پرویز میرا ایک کام کر دو گے؟'

'کہیے' میں نے ان کی متورم آنکھوں اور ٹمٹماتے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر بے بسی کے ساتھ کہا۔

'جاوید آج جا رہے ہیں؟'

'ہاں۔'

'کتنے بجے'

'رات کو ساڑھے دس بجے۔'

'اچھا......تو ان سے کہنا کہ جانے سے پہلے میں ان سے ایک مرتبہ ملنا چاہتی ہوں۔'

'بہت اچھا۔'

'اور دیکھو کہنا کہ سات بجے شام کے بعد سے میں ان کا یہاں باغ میں انتظار کروں گی وہ مجھ سے کھڑے کھڑے مل لیں۔'

'مگر انجم یہاں باغ میں تو رات کو شدید سردی ہوتی ہے۔'

'کوئی حرج نہیں میں ان کو زیادہ دیر نہیں روکوں گی۔'
'لیکن آپ خود؟'
'میری پروانہ کرو.....تو پرویز تم ان سے کہہ دو گے نا؟'
'ہاں ہاں ضرور۔'

میں دیر تک کھڑا ہوا ان کو ڈگمگاتے قدموں سے واپس جاتے ہوئے دیکھتا رہا گھر آ کر بھائی جان کو ان کا پیغام سنا دیا وہ سن کر چپ ہو گئے اور پھر سے مہمانوں کا تانتا لگ گیا۔ ابا جان کے دوست اور اماں کی سہیلیاں سب جمع ہونے لگیں کوئی امام ضامن لے کر آیا تھا اور کوئی صدقہ اتارتا تھا۔

شام گزری اور رات ہو گئی۔ 'بھائی جان آپ انجم سے مل لیجیے۔'
'وہ خود یہاں کیوں نہیں آ گئیں؟'
'باغ میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں نا۔'
'میں کس طرح جاؤں اتنے لوگ جمع ہیں۔'
'دس پندرہ منٹ کو ہو آتے اب آٹھ بج گئے اور وہ سات بجے سے وہاں آپ کی منتظر ہوں گی۔'
'اچھا دیکھو موقع نکالتا ہوں۔'
نو بج گئے۔
'بھائی جان اب نو بج چکے۔ آپ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں چلے جائیں گے'
'ہاں'
انجم سے مل لیجیے نا۔'
'دیکھو اماں کس قدر رو رہی ہیں۔ یہاں سے اٹھ کر گیا تو وہ کیا سوچیں گی'
'بس پانچ منٹ کے لیے۔'
'کوشش کرتا ہوں'
'بھائی جان دس بج گئے۔'
'کیا کروں پرویز سمجھ میں نہیں آتا۔'
'ایک لمحے کو ہو آئیے۔'
سوا دس ہوئے تو ابا جان نے کہا۔ 'بیٹا جاوید اب تمھاری روانگی کا وقت ہو گیا۔'
'چلتا ہوں ابا جان۔'
میں نے مضطرب ہو کر بھائی جان سے کہا۔ 'بھائی جان انجم'
'مجبور ہوں پرویز'
اور جب موٹروں میں بیٹھ کر سب اسٹیشن چلنے لگے تو میرے کانوں میں آپ سے آپ انجم کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں کاش بھائی جان ان سے لمحہ بھر کو ہی جا کر مل لیتے وہ اس شدت کی سردی میں دھڑکتے دل سے منتظر ہوں گی۔ اسٹیشن پہنچے تو اماں کی روتے روتے بری حالت ہو رہی تھی بھائی جان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ 'خط لکھتے رہنا پرویز۔'

جب ریل نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے آنسو پونچھ کر اماں سے کہا 'اب واپس چلیے۔' ابا جان تو بھائی جان کو چھوڑنے بمبئی گئے تھے۔ میں اور اماں لوٹ کر آئے اماں کے آنسو کسی طرح نہ تھمتے تھے ورنہ میں اسی وقت جا کر انجم سے ملتا میرے سینے میں آنسوؤں کے طوفان امل رہا تھا اور میری خواہش تھی کہ یہ سارے آنسو میں انہی کے سامنے جا کر بہاؤں.....ممکن ہے کہ ہم دونوں کو تسکین ہو جائے! رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور سینے میں نامعلوم چبھن ہوتی رہی۔

صبح کو چھ بجے کے قریب میں بستر سے اٹھ کر برآمدے میں نکل آیا۔ فروری کا شروع تھا اور گذشتہ رات غیر معمولی سردی رہ چکی تھی۔ کہر کے اثر سے آس پاس کچھ نظر نہ آتا تھا۔ خلا میں نظر جمائے خاموش کھڑا رہا جب سے سردیاں شدت کی ہوئیں تو انجم نے صبح سویرے کے بجائے دن چڑھے باغ میں نکلنا شروع کر دیا تھا۔ میرے اسکول کے اوقات بھی بدل گئے تھے اس لیے بھی دیر سے جایا کرتا تھا۔ آج ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ اس کہرے اور ٹھنڈ میں نکل جاؤں اور باغ کا چکر کاٹوں اور کوٹ پہن کر میں باغ میں چلا گیا۔ جہاں اوس سے ہر چیز تر تھی اور ٹھٹھری ہوئی نظر آتی تھی..... چکر لگا کر سنگ مرمر کے چبوترے تک پہنچا اور دفعتاً ٹھٹھک کر رہ گیا.....کوئی لیٹا ہوا تھا! شاید انجم

میں دوڑ کر قریب گیا.....وہی تو تھیں۔

'انجم.....انجم' وہ شاید سو رہی تھیں.....وہ اتنے سویرے بغیر کسی گرم کپڑے کے یہاں آ گئی ہیں اور اس برف جیسے سنگ مرمر پر لیٹی ہیں.....میں نے حیران ہو کر ان کا ہاتھ کھینچا 'انجم'۔

مگر وہ بے حس و حرکت تھیں کپڑے اوس کے اثر سے بالکل بھیگے ہوئے تھے ہاتھ برف سے زیادہ ٹھنڈے اور چہرہ سنگ مرمر سے زیادہ سفید کیا انھوں نے ساری رات یہاں گزاری ہے۔ اور یہ حالت!

بجلی کی طرح ایک دہشتناک خیال میرے دماغ میں پیدا ہوا اور میں نے ان کو پاگلوں کی طرح جھنجوڑ دیا 'انجم انجم'

انھوں نے آنکھیں کھول دیں چونک کر نہیں بلکہ سہم کر۔

'پرویز'

'یہ آپ کیا کر رہی تھیں' میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

’کب سے؟ دس بجے تک تو مجھے یاد ہے کہ میں بیٹھی ہوئی تھی!‘
’تو آپ رات بھر یہاں رہی ہیں؟‘
’ہاں۔‘
’اس شدید ٹھنڈ میں؟‘
’نہیں زیادہ ٹھنڈ تو نہ تھی۔‘
’واہ رات کو قیامت کی سردی تھی جب ہم اسٹیشن سے لوٹ رہے تھے تو دانت سے دانت بج رہا تھا۔‘
’تمھارے بھائی جان گئے؟‘
میں اس کا جواب نہ دے سکا
’تم نے میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟‘
میں اب بھی خاموش رہا
’اچھا یہ تو بتاؤ انھوں نے میرے لیے کوئی بات بھی نہیں کہلوائی‘
میں نے بیتاب ہو کر اُن سے کہا۔’انجم میں آپ سے یہاں بات نہ کروں گا خدا کے لیے اندر چلیے آپ کو احساس نہیں آپ کا کیا حال ہے؟‘
’چلو وہ چلنے لگیں مگر لڑکھڑا گئیں۔
’ٹھہرئیے‘ میں نے ان کے بازو کو سہارا دیا ان کے چہرے پر شبنم کی بوندیں چمک رہی تھیں اور کپڑے تو اس قدر تر تھے کہ نچوڑے جا سکتے تھے۔

میں نے اُن کو پکڑ کر ان کے کمرے تک پہنچا دیا اور واپس آتے ہوئے کہا کہ’میں اسکول سے واپسی پر آپ کے پاس آؤں گا۔ آپ جا کر آگ کے پاس بیٹھیے اگر خدا نہ کرے سردی لگ گئی تو غضب ہو جائے گا۔‘
اسکول گیا مگر مطلق کام نہ ہو سکا ایسا اضمحلال تھا کہ جس کو بیان ہی نہیں کر سکتا...... واپس لوٹا تو سیدھا ان کے یہاں گیا اور برآمدے میں ہی حیران کھڑا رہ گیا۔ کمرے سے ڈاکٹر نکل رہا تھا۔ وکیل صاحب بھی انتہائی پریشانی کے عالم میں ساتھ تھے۔
’کیا بات ہے؟‘ میں نے مضطرب ہو کر وکیل صاحب سے پوچھا۔
’انجم کی طبیعت خراب ہے!‘
میں سمجھ گیا کہ یہ رات کی سردی کا نتیجہ ہے کمرے میں جا کر دیکھا تو بخار کی تیزی سے بیہوش تھیں اور گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں! مجھ سے ضبط نہ ہو سکا آنکھوں سے آنسو بہنے لگے گھر آ کر اماں کو بتایا اور بستر پر گر پڑا’خدایا اب کیا ہوگا؟‘
پھر تھوڑی دیر بعد گیا وہی کیفیت تھی دیکھتا رہا اور پھر لوٹ آیا۔ صبح کو اسکول سے پہلے گیا پتہ چلا رات بھر طبیعت سخت خراب رہی ہے اور اب بھی بیہوش ہیں......
اسکول جانے کی ہمت نہ تھی مگر کہیں سکون بھی نہ ملتا تھا لاچار چلا گیا۔ اور پورے وقت کلاس میں سر جھکائے بیٹھا رہا شام کو دھڑکتے دل سے جا کر دیکھا...... سارے گھر میں مردنی چھا رہی تھی۔ برآمدے میں ڈاکٹر اور وکیل صاحب باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا’نمونیہ ہو گیا ہے دونوں پھیپھڑوں پر اثر ہے...... پوری احتیاط کیجیے آگے خدا مالک ہے۔‘
’میں وہیں سے بھاگ آیا اور باغ میں ایک تختے سے کمر لگا کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور دل کو کوئی دونوں ہاتھوں سے مسل رہا تھا۔
’اللہ کرے انجم اچھی ہو جائیں اور ان کے بدلے مجھے موت آ جائے۔‘
رات کو گیا دیر تک پلنگ کے پاس کھڑا رہا۔ ان کی طبیعت بدستور خراب تھی اور بیہوش تھیں...... میں نے واپس آ کر ساری رات کرسی پر بیٹھے گزار دی...... اور تڑپ تڑپ کر دو دو اور دن!
ڈاکٹروں نے انجکشن دے دے کر ان کے دونوں بازو چھلنی کر دیے تھے۔ مگر ان کو احساس نہ تھا۔
بیماری کے چار جان لیوا دن گزرنے کے بعد پانچویں دن صبح کو پتہ چلا کہ ان کی طبیعت بہتر ہے اور ہوش میں ہیں! میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا اماں اکثر وہیں رہتی تھیں اس وقت بھی موجود تھیں میں نے کمرے میں جا کر دیکھا تو انجم آنکھیں کھولے ہوئے لیٹی تھیں۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور جواب میں ایک مدھم سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں میں پھیل گئی۔
وکیل صاحب کی بیوی بھی مطمئن تھیں انھوں نے اماں سے ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔
’جاوید میاں کب لوٹیں گے۔‘
’اماں نے کہا’دو سال کی کہہ گیا ہے۔‘
’بہن تم نے ناحق جانے دیا ماشاءاللہ اچھے خاصے پڑھے لکھے تو ہیں۔‘
’آج کل کے زمانہ میں اماں باوا کی کون سنتا ہے جو جی میں آئے کرتے ہیں میں نے تو بہتیرا روکا مگر وہ باز نہ آیا۔‘
’پھر بھی آخر گئے کیوں ہیں؟‘
’کیا بتاؤں بہن آج کل لڑکیوں میں شرم کا تو نام نہیں دیدہ کا پانی ڈھل گیا ہے...... جاوید چچا کی بیماری میں گئے تھے ان کی لڑکی بہت فیشن

اصل ہے۔ بی۔ اے پاس ہے۔ وہ کہنے لگی کہ میں تو اس سے شادی کروں گی جس کے پاس ولایت کی ڈگری ہوگی۔ بس جاوید کو چڑھ گئی کہ ولایت جاؤں گا...... پھر کس کے کہنے سے رکتا۔'

'تو چچا کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟'

'اور کیا یہی تو بات ہے۔'

وکیل صاحب کی بیوی اور اماں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی اور میرا دم رکا جا رہا تھا۔ مجھے خود کو بھی علم نہ تھا کہ بھائی جان کس وجہ سے دفعتاً ولایت جانے کو تیار ہو گئے ہیں۔ اب پتہ چلا کہ چچا کی لڑکی نے یہ فرمائش کی تھی۔ کاش اماں نے یہ سب انجم کے سامنے نہ کہا ہوتا میں نے انجم کی طرف دیکھا تو انھوں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

وکیل صاحب نے آ کر کہا کہ ڈاکٹر نے مریض کے کمرے میں زیادہ بیٹھنے کو منع کر دیا ہے ہم واپس آ گئے۔

اماں کی گفتگو نے مجھے عجب الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ خدا خدا کر کے آج ان کی طبیعت سنبھلی تو یہ خبر سنی اب اللہ جانے اس کا کیا اثر لیں گی۔

شام کو گھر سے نکل ہی رہا تھا جوان کا نوکر بھاگتا ہوا آیا میں نے گھبرا کر پوچھا 'کیا بات ہے؟'

'بیگم صاحبہ کو جلدی بھیجئے انجم بی بی کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔'

میں اس کی بات ختم ہونے سے پہلے بھاگا اور سیدھا ان کے کمرے میں گیا...... یا اللہ کیا عجب عالم تھا تین چار ڈاکٹر پلنگ کے پاس جمع تھے اور بار بار انجکشن دے رہے تھے۔ انجم بالکل غافل تھیں اور زور زور سے انس آ رہا تھا۔ اتنی زور سے کہ باہر برآمدے میں بھی اس کی صاف آواز سنائی دے۔

وکیل صاحب نے روتے ہوئے کہا۔ 'اب کیا ہوگا۔'

ڈاکٹر نے مایوس لہجے میں جواب دیا۔ 'خدا بہت رحمان ہے دعا کیجیے۔'

میں تیر کی طرح کمرے سے باہر نکلا اور بے خبری میں بھاگتا ہوا باغ میں پہنچ کر اسی سنگ مرمر کے چبوترہ پر گر پڑا جس پر انجم نے ایک رات گزاری تھی۔ دماغ میں کوئی خیال تھا نہ دل کو صدمے کا احساس۔ میں پھوٹ پھوٹ کر روتا گیا یہاں تک کہ سر چکرانے لگا۔ ہاتھ پیر ڈھیلے ہوتے گئے...... اور میں بیہوش ہو گیا۔

پھر ہوش آیا رات کا وقت تھا اندھیرا جس میں پھیکی چاندنی کا بس نہ چل رہا تھا...... وہاں اب کچھ باقی بھی ہوگا۔ یا سب کچھ ختم ہو چکا۔ میرے قدم گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ جہاں گہری خاموشی طاری تھی...... یا اللہ اب کیا۔ میں نے ستون کا سہارا لیتے ہوئے سوچا...... برابر سے ایک نوکر گزرا میں نے بمشکل کہا۔

'انجم'

اس نے کہا 'اچھی ہیں'

'اچھی ہیں' میں پھر بھاگا اور کمرے کے پاس جا کر رک گیا انجم کی والدہ برآمدے میں بیٹھی تھیں۔

'انجم کیسی ہیں؟'

'خدا کا شکر ہے۔'

'میں جا کر دیکھ لوں؟'

'ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے کہ بات چیت نہ کریں۔'

'میں بات نہ کروں گا۔'

'اچھا تو جا کر دیکھ لو۔'

میں آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا وہ آنکھیں کھولے ہوئے دروازے کی طرف رخ کیے لیٹی تھیں مجھے دیکھ لیا۔

'کیا حال چال ہے' بے حد نحیف آواز سنائی دی۔

میں بے قرار ہو کر پلنگ کے پاس دو زانو ہو گیا۔

'آپ اچھی ہیں تو میں بھی اچھا ہوں۔'

'آنکھیں سوج رہی ہیں۔ کیا روئے تھے؟'

میں نے بے قابو ہو کر ان کے ہاتھ کو تھام لیا اور کوشش کے باوجود آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کی آنکھوں میں بھی آنسو چمک رہے تھے۔

مسرت کے احساس نے مجھے بے خود کر دیا اور اپنے حواس سنبھالنے کو میں کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر تکنے لگا۔ جہاں آسمان پر تاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ایک چمکتا ہوا بڑا سا تارہ ٹوٹا اور اندھیرے میں ڈوب گیا میں نے مڑ کر انجم کی طرف دیکھا تو وہ بھی آسمان کو تک رہی تھیں۔

'یہ تارے کیوں ٹوٹا کرتے ہیں؟' میں نے موضوع بدلنے کے خیال سے کہا۔

'جب کسی انسان کی موت آتی ہے تو آسمان سے ایک چمکتا ہوا تارا ٹوٹ کر تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے۔'

میں نے کہا کہا۔ 'واہ یہ آپ نے نرالی منطق نکالی۔'

'نہیں سچ کہہ رہی ہوں۔'

'اچھا خیر ہوگا۔' میں نے چاہا کہ کسی طرح بات کو ٹال دوں۔

'پرویز تم کو میرا نام تو معلوم ہے؟'

'جی ہاں کیوں نہیں۔' میں اس سوال پر حیران ہوگیا۔

'جانتے ہو انجم کسے کہتے ہیں؟'

میں بات کا مطلب سمجھ گیا۔ 'مجھے نہیں معلوم۔'

'تارے کو کہتے ہیں'

اس سے قبل کہ میں کچھ کہوں ان کی والدہ کمرے میں داخل ہوگئیں۔

'پرویز تم نے وعدہ کیا تھا کہ بات نہیں کروں گا۔'

'معاف کیجیے...... چلتا ہوں۔' میں انجم کو خدا حافظ کہہ کر اطمینان اور خوشی کے سانس لیتے ہوئے گھر لوٹا۔ اب ان کی طبیعت بہتر ہے خدا نے چاہا تو دو چار دن میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔

کئی دن بعد رات کو نیند آئی اور میں بے سدھ ہو کر سو گیا۔

صبح کو آنکھ کھلی کمرے سے باہر نکلا تو اماں موجود نہ تھیں۔ میں نے نوکر سے پوچھا 'اماں کہاں ہیں؟'

'وکیل کہاں ہیں؟'

'وکیل صاحب کے یہاں۔'

میرا جی دھک سے ہوگیا.........پھر سے طبیعت خراب نہ ہوگئی ہو۔ ننگے پاؤں نکل کر دوڑا۔

بہت لوگ جمع تھے میں دیوانوں کی طرح سب کے بیچ میں سے گزرتا ہوا اندر داخل ہوا رونے کی آوازیں چاروں طرف سے سنائی دے رہی تھیں......اور جب میں نے کمرے میں قدم رکھا تو میری نگاہیں انجم کے پلنگ سے ٹکرائیں۔ نہ وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ نہ ہنستے ہوئے لب.....صرف ایک سفید چادر......جس نے ان کا آخری پیغام مجھ تک پہنچا دیا.........تارہ ٹوٹ چکا تھا۔

□□□

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر........................ بتاریخ........................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com,sales@ncpul.in

دستخط

رونق دہلوی

درد میرا تو ہے زمانے کا

زندگی کیا ہے تیرا پیمانہ؟
درد تو ہے تو پھر دوا کیا ہے
تو سمائی ہے کتنے رنگوں میں
اور ہر رنگ مجھ میں شامل ہے
درد سب تیرے دیکھے بھالے ہیں
پھر بھی کیوں مجھ سے روٹھی رہتی ہے
یہ یقیں ہے تو مان جائے گی
اور اک روز مسکرائے گی!

ان اندھیروں سے روشنی کی طرف
آخرش کون لے کے جائے گا؟
آسماں سے کوئی نہ آئے گا
اور اچانک نہ معجزہ ہوگا
جھانک کر خود میں اپنے اندر کا
روشن عقل ڈھونڈنا ہوگا
تب جلے گا چراغ فکر و عمل
جس سے دنیا میں روشنی ہوگی
ہر طرف پھیل جائے گی رونق
زندگی! اب تو مسکرائے گی؟

درد میرا تو ہے زمانے کا
آنکھیں دیکھی ہیں غم کے ماروں کی
بے کسوں اور بے سہاروں کی
جن میں سیلاب رنج و غم کا ہے
شہر ویران سے ہیں ان کے لیے
اور سنسان دل کی گلیاں ہیں
خاک اڑتی ہے ان کے آنگن میں
خوف و دہشت کا رقص ہوتا ہے
درد کی شام کے اندھیروں میں

Ronaq Dehelvi
Ghazala Apartment, Batla House,
Jamia Nagar, New Delhi-110025
Mob: 7827709360

تحسین کاظمی

غزل

جلانے دل مرا نزدیک دل کے آنے لگے
چرا کے میری غزل مجھ کو ہی سنانے لگے

گلوں پہ شبنمی قطرے ہیں مستعار اشک
جو اس کے عارض دلکش پہ جھلملانے لگے

خموش تھے تو تہی دست تھا یہ دامن دید
جو لب کشا ہوئے موتی سے جگمگانے لگے

کبھی لے زلف پریشاں ہوئی اُدھر اس کی
چمن سے پھولوں کی خوشبو ادھر جو آنے لگے

پشیماں تو ہوا کیا اپنی بے وفائی پر
کہ تیری آنکھوں میں آنسو سے جھلملانے لگے

ہر اک کو لگنے لگی اپنی داستان حیات
فسانہ اپنا جو دنیا کو ہم سنانے لگے

بلند کتنا ہے رتبہ نظر میں ان کی مرا
خدا کو چھوڑ کے قسمیں مری وہ کھانے لگے

نہ نکلو چاندنی راتوں میں بے حجاب ہو کر
کہ زاہدوں کے بھی ایمان ڈگمگانے لگے

یہ رنگ و نغم بھی تو یاں اس کی ہی عنایت ہے
اسی سے یہ تجھے تحسین آج بھانے لگے

Tahseen Kazmi
S.Gulzar Husain Kazmi
Mirza International Ltd.
C/o Kisan Transport Co.
Purani Chungi.Bulandshahar Road.
Hapur-245101 (U.P)

سیدہ نفیس بانو شمع

غزل

چشم پرنم میں تری کتنے قلندر ڈوبے
یہ سمندر کا سفر ہے یہاں رہبر ڈوبے

ساقیا بھر دے کم و کیف کے پیمانے کو
جب نظر مجھ سے ملے میرا مقدر ڈوبے

کر چکا قتل تمنا تو پشیماں بولا!
ہائے یہ کس کے لہو میں مرے خنجر ڈوبے

تم مری پیاس کی معراج کا عالم دیکھو
خشک ہونٹوں پہ مرے کتنے سمندر ڈوبے

ہاں بھنور سے تو نکل آئی تھی کشتی لیکن
حکم اس کا تھا کہ ساحل پہ اتر کر ڈوبے

اشک محبوب تھا یا بحر یا شبنم کیا تھا
غیرت عشق میں یہ سارے گل تر ڈوبے

تو نے کیا بات کہی شمع غزل میں اپنی
دل کی بستی میں یہاں کتنے سخن ور ڈوبے

نظمیں

پروین شیر

تخلیقیت

فکر کی پو پھٹی
راستوں کی ہیجلی سے لپٹی ہوئی
رات سے اک سنہری، بجیلی کرن
یوں ہویدا ہوئی
جیسے درخشاں ستاروں کا اک جال ہو
یا رو پہلے دیے کی تھرکتی ہوئی
ایک لو نور کی کھینچتی ہو لکیریں یہاں
یا سیاہی کی چادر پہ ہو جھلملی چاندی کی گوٹ کی
دل کے ایوان میں گنگناتے ہوئے
سارے الفاظ جیسے کلیسے میں بجتی ہوئی نقرئی گھنٹیاں
اُڑ کے آئے تو بے جان قرطاس کے دل دھڑکنے لگے
کتنے سیماب جذبوں کے بپھرے ہوئے
ہر رگِ جاں میں سیلاب کے بند ٹوٹے ہوئے

درخشاں اندرابی

فریم

فریم سے اتر آیا
میری تنہائی بانٹنے میرا کل
اور میرے آج کو
ماضی کر گیا
میں ایک فریم کی طرح
سوکھے پھولوں کی مالا پہنے
جی رہی ہوں
اور محسوس کر رہی ہوں
آنے والے لمحوں کی اگربتیوں کی مہک

ہتھیلی پر سورج

مٹھی بھر آسمان کی سوغات دے کر
جوگی اندھیرے کی گلی میں چلا گیا
آنکھوں میں چراغوں کا جلوس لیے
میں اُجالے کی دیس میں
بھٹک رہی ہوں
ہتھیلی پر لیے سورج
اندھیروں کا خوف
کرن کرن تعاقب کر رہا ہے میرا۔۔۔!!

عذرا نقوی

غزل

ابھی تو پچھلی عنایت کا زخم تازہ ہے
سنا ہے اک نئی سازش کا پھر ارادہ ہے

کدورتوں کے سبق، جھوٹ کے جدید نصاب
نہ جانے کون سی تاریخ کا اعادہ ہے

وہ گھڑ رہے ہیں نئے زہر میں بجھے الفاظ
یہ نفرتوں کی لغت سے ہی استفادہ ہے

یہ کہہ کے لوگوں نے قبلے بدل لیے اپنے
یہی تو مصلحت وقت کا تقاضہ ہے

عجیب لہجے میں حق مانگنے لگے ہیں لوگ
کہ احتجاج ہے کم، بے بسی زیادہ ہے

نہ ہو تباہ، یہ صد رنگ مشترک تہذیب
مرے وطن، مری تاریخ کا اثاثہ ہے

کہاں سے لاؤں، سہانی، مدھر، لطیف غزل
مرے مزاج میں اب برہمی زیادہ ہے

کہکشاں تبسم

غزل

گھروں سے نکلے نہیں جب خریدنے والے
دکاں بڑھاتے گئے خواب بیچنے والے

ہوا کے دوش پہ رقصاں ہے شہریار ابھی
خموش بیٹھے ہیں دھاگا لپیٹنے والے

زمیں نچوڑ کے کاسہ میں بھر چکے اور اب
فلک پہ ماہ و نجم ہیں سمیٹنے والے

اڑی جو راکھ تو شعلہ لپک نہ جائے کہیں
خیال رکھنا! ذرا ماضی کریدنے والے

زمینِ عشق کی شادابیاں ہمیں سے ہیں
ہمیں نہ چھیڑ! جڑیں اپنی کھودنے والے

لٹا ہی بیٹھے بصارت ہوس کے جلوے میں
زمین پاؤں کے نیچے سے کھینچنے والے

تمھاری فکر رہے کہکشاں سلامت بس
وہ اور لوگ ہیں شہرت بٹورنے والے

لذیذ پکوان

گڑ، املی اور آلو بخارے کی چٹنی

اجزا: املی ایک باؤل، آلو بخارے ایک باؤل، کٹی لال مرچ ایک کھانے کا چمچ، کالا نمک یا پی بی ایک چائے کا چمچ، رنگ ایک چٹکی

ترکیب: ایک باؤل املی کو بھگو کر بیج نکال لیں۔ ایک باؤل آلو بخارے کو پانی میں بھگوئیں۔ ایک باؤل گڑ کو باریک کوٹ لیں۔ ایک پین میں املی، گڑ، آلو بخارہ، ایک کھانے کا چمچ کٹی لال مرچ، ایک چائے کا چمچ کالا نمک، ایک چٹکی رنگ اور پانی ڈال کر پکائیں۔ جب چٹنی گاڑھی ہوجائے تو اتار لیں اور ٹھنڈا کر کے ائر ٹائٹ کنٹینر میں بھر دیں۔ عید کے دو ن میں بھی آپ اسے انجوائے کر سکتے ہیں۔

انار کا سالسہ

اجزا: ڈھائی کپ انار کے دانے، سوا کپ چھوٹے ٹکڑوں میں کٹے کھیرے، ایک سے تین میکسیکن ہری مرچ جالاپینو (جس کے بیج نکال کر اسے کاٹ لیں۔ چوتھائی سے ایک تہائی کپ کٹا ہوا دھنیا، ایک کپ باریک کٹی ہوئی سرخ پیاز، آدھے لیموں کا رس

ترکیب: تمام اجزا کو ایک برتن میں ڈال دیں آغاز میں صرف

ایک میکسیکن ہری مرچ ڈال لیں، پھر چمچ سے سب کو آپس میں ملا لیں۔ اگر خواہش ہو تو مزید مرچ شامل کر دیں۔

فش برگر

اجزا: بن بنانے کے لیے

میدہ دو کپ، بٹر دو کھانے کے چمچے، چینی دو کھانے کے چمچے، خمیر 1-1/2 کھانے کا چمچ، انڈا ایک عدد، دودھ ایک کپ

ترکیب: تمام چیزیں میدے میں مکس کر کے دودھ سے گوندھ کر 30 منٹ کور کر کے رکھ دیجئے گا اور بن بنا کر انڈا لگا کر 15 منٹ کے

لئے چھوڑ دیں اسکے بعد 200 سینٹی گریڈ پر بیک کرلیں۔

½ آلو چھلی کے پیس لے کر ہر پیس پر نمک، کالی مرچ، مسٹرڈ پیسٹ ½ آدھے کا چمچہ پسی لال مرچ لگا کر اچھی طرح سے ملیں۔ اب انڈے میں اچھی طرح ڈپ کرنے کے بعد روٹی کا چورا لگا کر فرائی کرلیں۔ مایو میں دو کھانے کا چمچہ لیموں کا جوس، سرکہ، ½ کپ کٹی ہوئی پیاز، نمک، کالی مرچ ڈال کر مکس کیجئے۔ بن پر لگا کر فش رکھیں۔ چیز سلائس رکھ کر پیش کیجئے۔

آلو کے کباب

اجزا: آلو آدھا کلو، قیمہ ایک کپ اُبلا ہوا، بیسن ایک کپ، پیاز آدھا کپ کٹی ہوئی، ہرا دھنیا، آدھا کپ کٹا ہوا، ہری مرچ چار یا پانچ عدد کٹی ہوئی، نمک حسب ذائقہ، لال مرچ ایک کھانے کا چمچ کٹی ہوئی دھنیا، دو کھانے کے چمچ، زیرہ دو کھانے کے چمچ، ہلدی ایک چٹکی، سوڈا، ایک چٹکی، پسی کھٹائی، ڈیڑھ کھانے کا چمچ، ادرک ڈیڑھ کھانے کا چمچ کٹی ہوئی۔

ترکیب: آلو اُبال کر چھلیں اور اُن میں اُبلا قیمہ، کٹی پیاز، ہرا دھنیا، کٹی ہری مرچ، نمک، کٹی لال مرچ، دھنیا، زیرہ، پسی کھٹائی اور کٹی ادرک مکس کرکے کباب بنالیں۔

اب بیسن کو پھینٹ کر اس میں نمک، پسی لال مرچ، ہلدی اور سوڈا ملا کر دس منٹ کے لیے رکھیں۔

پھر اس میں آلو کے کباب بنا کر ڈیپ فرائی کریں اور سرو کردیں۔

آلو کا رائتہ

اجزا: اُبلے آلو 3 عدد، دہی ایک کلو، تازہ دودھ ایک پیالی، چینی 2 کھانے کے چمچے، نمک حسب ذائقہ، باریک کٹا پودینہ ½ گٹھی، کارن فلور ایک کھانے کا چمچہ، پسا سفید زیرہ ½ کھانے کا چمچہ، کٹی کالی مرچ آدھی ایک چائے کا چمچہ

بگھار کے اجزا

ثابت لال مرچ 4 عدد، سفید زیرہ 1/2 چائے کا چمچہ، کڑی پتے چند عدد، میتھی دانہ بھی 4 عدد، تیل 3 کھانے کے چمچے

ترکیب: پہلے 3 عدد اُبلے آلوؤں کو میش کرلیں۔ اب بڑے پیالے میں ایک کلو دہی، اُبلے آلو، ایک پیالی تازہ دودھ، 2 کھانے کے چمچے، حسب ذائقہ نمک، 1/2 گٹھی باریک کٹا پودینہ، ایک کھانے کا چمچہ کارن فلور، 1/2 کھانے کا چمچہ پسا سفید زیرہ اور ایک چائے کا چمچہ کٹی کالی مرچ، اچھی طرح مکس کرکے تھوڑی دیر کے لئے رکھ دیں۔

اب 3 کھانے کے چمچے تیل گرم کرکے 4 عدد ثابت لال مرچ، 1/2 چائے کا چمچہ سفید زیرہ، چند کڑی پتے اور 4 عدد میتھی دانے ڈال کر بگھار تیار کریں اور رائتے پر ڈال کر گرم گرم پراٹھے کے ساتھ سرو کریں۔

بادام کا حلوہ

اجزا: بادام کا پیسٹ ایک کپ، گھی ایک کپ، سوجی دو سو پچاس گرام، دودھ دو کپ، چینی آدھا کپ، کھویا دو سو پچاس گرام، آلمنڈ ایسنس ایک چائے کا چمچ، بادام سجاوٹ کے لئے

ترکیب: گھی کو گرم کرکے اس میں سوجی ڈال کر بھون لیں یہاں تک کہ خوشبو آنے لگ جائے۔ پھر دودھ، چینی اور بادام پیسٹ ڈال کر مکس کرلیں اور فرائی کرلیں۔ اب کھویا، آلمنڈ ایسنس ڈال کر اچھی طرح مکس کریں یہاں تک کہ گھی اوپر آجائے۔ سرونگ پلیٹر میں نکال کر بادام سے سجا کر پیش کریں

ایک ہفتے میں 150 منٹ کی ورزش یا واک کی جائے تو خواتین کئی بیماریوں سے بچ سکتی ہیں

ٹورانٹو (سی ایم لنکس) چھاتی کا سرطان دنیا بھر کی خواتین کے لیے ایک ڈراؤنا خواب بن چکا ہے اور اس موذی مرض میں مبتلا ہونے والی خواتین کی 25 فیصد تعداد پر صحت یاب ہونے کے بعد بھی یہ مرض دوبارہ حملہ کرتا ہے لیکن باقاعدہ ورزش اور جاگنگ سے یہ خطرہ 40 فیصد تک کم کیا جاسکتا ہے۔ ٹورانٹو میں واقع سنی بروک ہیلتھ سائنس سینٹر کے ماہرین نے بریسٹ کینسر سے شفایاب ہونے والی خواتین کے 67 مطالعات کا جائزہ لیا ہے۔ اور ان کی صحت یابی میں علاج کے علاوہ غذا، وزن اور ورزش وغیرہ کے درمیان کسی ممکنہ تعلق کو تلاش کیا ہے جس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ورزش سے کینسر کے دوسرے حملے اور موت کا خطرہ 40 فیصد تک کم ہوجاتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ بریسٹ کینسر سے اموات سے بچنے کا سب سے بہترین اور قابل عمل نسخہ یہی ہے کہ ایک ہفتے میں 150 منٹ کی ورزش یا واک کی جائے تاہم یہ بریسٹ کینسر سے صحت یابی کے بعد شروع کی جائے کیونکہ اس سے مرض دوبارہ لاحق ہونے کو بہت حد تک ٹالا جاسکتا ہے۔ ماہرین اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شاید ورزش بدن میں سوزش اور جلن کے عمل کو روکتی ہے اور اس طرح خلیات میں ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوتی اور وہ سرطانی ہونے سے بچے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ورزش کینسر بڑھنے کو بھی روکتی ہے۔ اس مطالعے کا ایک جھول یہ ہے کہ خود خواتین کو یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ کتنی ورزش کرسکتی ہیں کیونکہ کینسر سے شفا کے بعد بھی کمزوری برقرار رہتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری بار لاحق ہونے والا کینسر اگر نظر میں نہ بھی آئے تب بھی خواتین کو جلد تھکا دیتا ہے اور ورزش کے فوائد کم ہوجاتے ہیں۔ واشنگٹن میں فریڈ ہچنسن کینسر مرکز کی اسکالر کے مطابق اگر خواتین کو ان کی مرضی کی ورزش کچھ عرصے تک کرنے دی جائے تو اس کے فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔

گرمی کو شکست دینے کے 7 طریقے

ماہرین غذائیت لوگوں کو ان 7 بیماریوں سے خبردار کررہے ہیں، جو سال کے گرم ترین دنوں میں آپ کو اپنا نشانہ بناسکتی ہیں۔ ان میں لولگنا، ملیریا، زہرخورانی، بخار، ڈینگی بخار، ڈائریا، اور یرقان شامل ہیں۔ ماہرین غذائیت کا کہنا ہے کہ اگر آپ علامات کو وقت پر پہچان جائیں، تو آپ ان سے بچ سکتے ہیں۔ ورنہ ایک ہیٹ اسٹروک دیگر نقصانات اور کمزوری کا سبب بن سکتا ہے۔ ایک اور ماہر غذائیت کا کہنا ہے کہ جو افراد دل کی بیماری میں مبتلا ہیں، ان کو زیادہ احتیاط کرنی چاہیے کیونکہ گرمیوں میں دل کے دورے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "پانی کی کمی کی وجہ سے خون کم ہوجاتا ہے، جس کی وجہ سے دل کے لیے اسے پمپ کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اس کی وجہ سے فرد میں خون جمنے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ذیابیطس کے مریض بھی خطرے کی زد میں ہوتے ہیں، کیونکہ زیادہ پیشاب آنا ایک عام علامت ہے، اس لیے اس گرم موسم میں جسم سے پانی کا اخراج زیادہ ہوتا ہے۔" 1۔ کیڑوں سے بچاؤ کی ادویات استعمال کریں مچھر اور مکھی ڈینگی اور ملیریا جیسی بیماریاں پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔ ان سے بچاؤ کے لیے ادویات کا استعمال کرنا چاہیے، ورنہ کیڑوں کے کاٹنے سے کئی بیماریاں جنم لے سکتی ہیں، جن میں خارش، بے چینی، اور سنگین بیماریاں تک شامل ہیں۔ مچھر دن میں کسی بھی وقت کاٹ سکتے ہیں، لیکن صبح اور شام کے وقت یہ زیادہ فعال ہوتے ہیں، اور گرمیوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔

2۔ ڈھیلے کپڑے پہنیں ڈھیلے اور ہلکے رنگوں کے ملبوسات کاٹن جیسے ہوادار کپڑوں میں پہنیں، تاکہ پسینہ سوکھ سکے۔ اگر آپ مچھروں کے کاٹنے کے وقت باہر ہوں، تو پوری پینٹیں اور بند جوتے پہنیں۔ اگر آپ شام کے وقت پارک میں جائیں، تو جرابیں ٹخنوں سے اوپر چڑھا لیں، اور شرٹ

چینٹ کے اندر اوڑس لیں۔3۔ پانی اچھی طرح پئیں اپنے جسم میں نمکیات اور پانی کا توازن برقرار رکھنا چاہیے۔ خاص طور پر پانی کے ذریعے۔ الکوحل اور کیفین والے مشروبات سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جسم کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے کھیرے کا جوس، ناریل کا پانی، لیموں کا جوس، ایک چیچ معدنی نمک مثلاً سمندری نمک یا ہمالیائی گلابی نمک کے ساتھ پانی استعمال کرنا چاہیے۔4۔ گھر میں ورزش کریں ورزش کرنے کے لیے دن کے ٹھنڈے وقت کا انتخاب کریں۔ یعنی جب سورج کی گرمی کم ہو، جیسے صبح یا شام کے وقت۔ اگر موسم گرم اور نمی والا ہو، تو زیادہ سخت اور زیادہ دیر تک ورزش نہ کریں۔ اس کے علاوہ ورزش کرنے کے لیے کسی ٹھنڈی جگہ کا انتخاب کرنا بھی برا نہیں ہوگا، جیسے جم، مال، یا ایسی ہی کوئی جگہ۔ اس طرح آپ پر تھکان طاری نہیں ہوگی۔5۔ کھانا باہر مت کھائیں ٹھنڈے کھانوں کو ٹھنڈا اور گرم کھانوں کو گرم رکھنا چاہیے۔ جب بھی آپ کھانا کھا چکے ہوں، تو بچے ہوئے کھانے کو فوراً ریفریجریٹر میں رکھ دینا چاہیے۔ دو گھنٹے سے زیادہ دیر تک کھانا باہر نہیں رکھنا چاہیے۔ اگر دن زیادہ گرم ہو تو یہ وقت صرف ایک گھنٹہ ہونا چاہیے۔ اس بات کا دھیان رہے کہ کھانے کی چیزیں ٹھنڈی یا گرمی سے بچانے والی تھیلیوں میں بند ہوں۔ کیفین اور تیل سے بھرپور چیزیں، اور تلے ہوئے یا پیک شدہ کھانے کم کر دینے چاہئیں۔ تازہ پھلوں اور سبزیوں کا استعمال بڑھا دینا چاہیے، خاص طور پر کچا سلاد اور ایسے پھل کھانے چاہئیں جن میں پانی زیادہ ہو جیسے کھیرا، تربوز، آم، کینو، خربوزہ، گاجر، وغیرہ۔ ماہر خوراک کا کہنا ہے کہ اس موسم میں خاص طور پر گھر میں پکے ہوئے تازہ، اور صاف ستھرے کھانے کھانے چاہئیں۔ گھر میں کھانے کو درست درجہ حرارت پر رکھنا چاہیے، اور جتنا ہو سکے، باہر کا کھانا کم سے کم کریں۔ تھوڑی سی بھی لاپرواہی سے مختلف اقسام کے انفیکشن ہو سکتے ہیں لہٰذا کھانے اور پینے میں احتیاط کرنی چاہیے۔6۔ سن بلاک کا استعمال کریں اس میں کوئی شک نہیں کہ دھوپ وٹامن ڈی کا بہت اچھا ذریعہ ہے، لیکن الٹراوائیلٹ شعاعوں کا نقصان شدید اور طویل مدتی ہو سکتا ہے۔ جب بھی آپ باہر ہوں، تو اپنے جسم کے کھلے حصوں پر سن اسکرین لگائیں۔ اسے اپنے پورے جسم پر گھر سے باہر نکلنے سے کم از کم تیس منٹ پہلے لگائیں۔ گھر سے باہر نکلیں تو سر پر ہیٹ پہنیں اور اپنے ساتھ پانی کی ایک بوتل ضرور رکھیں، اور ہر 20 سے 30 منٹ کے بعد ایک گھونٹ بھرے۔ ماہرین کے مطابق ایک اسپرے رکھنا چاہیے۔ جس میں عرق گلاب، یا پیپرمنٹ اسنس پانی کے ساتھ ملایا جائے، جس سے چہرے کو ٹھنڈا رکھا جا سکتا ہے۔ وٹامن ڈی کی کمی سے ہڈیوں کے فریکچر، اوسٹیوپوروسس، اور کمر اور جوڑوں کا درد جنم لیتا ہے۔ کیونکہ ہماری زندگیاں اب مکمل طور پر گھروں اور آفسوں تک محدود ہو گئی ہیں، تبھی وٹامن ڈی کی کمی اب عام ہے۔7۔ گرم پانی میں نہانے سے پرہیز کریں بیکٹیریا یا فولیری کو گرم پانی بہت پسند ہوتا ہے۔ اس لیے کوشش کریں کہ سوئمنگ پول میں کلورین اچھی طرح شامل ہو، یا پھر کم گہرے اور گرم پانی والی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے اجتناب کریں۔ اس لاعلاج اور ہلاکت خیز مرض سے صرف بچاؤ ہی جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ناک کے کلپ خرید یں، اور اپنا سر پانی سے اوپر رکھیں تاکہ پانی کو ناک میں جانے سے بچایا جا سکے۔

گرمیوں میں جسمانی بو سے بچنے کے مددگار طریقے

اگرچہ پسینہ آنا ایک قدرتی عمل ہے جو جسم کو ٹھنڈا رکھنے میں مدد دیتا ہے تاہم اکثر افراد میں یہ جسمانی بو کا باعث بنتا ہے۔ موسم گرما کا آغاز ہو چکا ہے اور اب ہر گزرتے دن کے ساتھ درجہ حرارت میں اضافے کا ہی امکان ہے۔ ویسے یہ جان لیں کہ پسینہ بے بو ہوتا ہے درحقیقت سطح پر موجود بیکٹیریا کا رابطہ پسینے سے ہوتا ہے تو جسمانی بو پیدا ہوتی ہے۔ پسینے کی ناگوار بو سے نجات کا آسان نسخہ اس موسم میں اگر آپ کو بھی بہت زیادہ پسینہ آتا ہے۔

یا بو کے مسئلے کا سامنا ہے تو اس سے نجات بہت آسان ہے۔ جس کے آسان طریقے یہاں بتائے جا رہے ہیں۔ کلون سے مدد لیں کلون بنیادی طور پر پانی پر مشتمل ہوتا ہے یا معمولی مقدار میں الکحل اس میں شامل ہوتا ہے، تو اس کا چھڑکاؤ زیادہ پسینہ آنے پر بھی جسمانی بدبو کو دبا کر رکھتا ہے۔ عرق گلاب کو نہانے کے پانی میں شامل کرنا پسینے سے پیدا ہونے والی بو کو دور کرتا ہے۔ یہ قدرتی طور پر ٹھنڈک پہنچانے میں مددگار اور فطرت کا پرفیوم ہے۔ نہانے کے پانی میں کلون کا اضافہ کرنا بھی اس حوالے سے مددگار ثابت ہو سکتا ہے، یا نہانے کے آخری ڈونگے میں اس کی کچھ مقدار کا اضافہ کریں جو کہ ٹھنڈک بھی پہنچاتا ہے۔ بیکنگ سوڈا بھی جسمانی بو کی روک تھام میں مدد دیتا ہے، بیکنگ سوڈا اور پانی کا پیسٹ بنائیں اور اسے مختلف حصوں جیسے بغلوں، پیروں اور ہاتھوں پر لگانا بو پیدا کرنے والے بیکٹیریا کے خلاف مزاحمت کرتا ہے۔ آلو کے ٹکڑوں کو بھی ان جسمانی حصوں پر رگڑنا فائدہ مند ہے جہاں بو جلد پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک چائے کے چیچ پھٹکری کا نہانے کے پانی میں اضافہ بھی اس حوالے سے مدد دیتا ہے، اس میں پودینے کے چند پتوں کو پیس کر بھی شامل کریں۔ ٹی ٹری آئل 2 قطرے اس تیل کو 2 کھانے کے چیچ پانی یا عرق گلاب میں شامل کریں اور اسے روئی کی مدد سے بغلوں پر لگائیں۔

حسن کی نگہداشت

چہرے کے بالوں سے تنگ خواتین

ایک پیالی میں لیموں کا رس لے کر اس میں 30 گرام چینی شامل کریں اور اچھی طرح حل کر لیں۔ اب اس محلول کو چہرے کے بالوں پر لگائیں اور 15 منٹ تک لگا رہنے دیں۔ اس کے بعد تازہ پانی سے دھو لیں، یہ عمل ہفتے میں ایک بار ضرور کریں۔

بیسن، ہلدی اور دہی کو مکس کریں اور اس محلول کو چہرے پر جب تک لگا رہنے دیں جب تک یہ خشک نہ ہو جائے۔ یہ آپ کے چہرے پر اضافی بالوں کو پیدا ہونے سے روکے گا۔

پپیتے اور ہلدی کو مکس کریں اور اس سے چہرے کا مساج کریں۔ یہ آپ کے چہرے سے غیر ضروری بال بھی صاف کرے گا اور ساتھ اسے تروتازہ بھی رکھے گا۔

کیلے اور جو کو مکس کریں اور اس محلول کو چہرے پر 15 منٹ تک لگا رہنے دیں۔ اس عمل کو ہفتے میں دو بار دہرائیں اور تروتازہ بالوں سے پاک چہرے پائیں۔

چہرے کا مساج

طبی ماہرین کے مطابق بادام کا تیل صحت کے لئے بہترین ہے۔ چہرے پر بادام کے تیل کی مالش سے چہرہ تروتازہ اور شاداب رہتا ہے۔ یہ طریقہ ماضی میں بہت مقبول تھا شاہی گھرانے کی خواتین اسے معمول میں شامل رکھتی تھیں ۔ اب اسے میجک آف ایسٹ کے نام سے مغربی ممالک میں کافی پزیرائی حاصل ہے۔ یہ طریقہ نہایت آسان ہے اس لئے اسے اتنا سراہا گیا ہے۔ سب سے پہلے آپ اپنے چہرے کو دودھ میں بھیگے کاٹن سے صاف کیجیے، صفائی کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ رگڑ نہ زیادہ

ہلکی ہو اور نہ زیادہ تیز بس درمیانی دباؤ رکھیں۔ اب نیم گرم روغن بادام میں عرق گلاب کے چند قطرے شامل کر کے چہرے پر مساج کے انداز میں ہلکے ہلکے مالش کریں اور یہ عمل پانچ منٹ تک جاری رکھیں اس طرح چہرے کی ورزش بھی ہو جائے گی اور چہرے پر نظر آنے والی جھریاں بھی آہستہ آہستہ ختم ہو جائیں گی۔

جلد کو دلکش اور بالوں کو چمکدار بنانے والا پھل

یوں تو پھلوں میں انسانی جسم کو طاقت دینے اور توانائی بخشنے کی بے پناہ صلاحیتیں ہوتی ہیں اور ہر پھل اپنے اندر منفرد خصوصیات سمیٹے ہوئے ہے ان ہی پھلوں میں پپیتے کو ایک اہم مقام حاصل ہے جو اپنی دیگر خوبیوں کے ساتھ انسانی جلد کو دلکش بنانے اور بالوں کو چمکدار بنانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

جلد کو چمکدار اور دلکش بنانا: پپیتے میں وٹامن اے اور پاپین انزائم پائے جاتے ہیں جو جلد کے مردہ خلیوں کو دوبارہ سرگرم کر دیتے ہیں جس سے جلد تازہ اور چمکدار لگنے لگتی ہے جب کہ یہ جلد کو خشک ہونے سے بھی بچاتا ہے۔ جلد کی تازگی کے لیے پپیتے کے ماسک کا استعمال کیا جائے اس کے لیے آدھے پپیتے کا اچھی طرح پیسٹ بنالیں اور اس میں 3 چمچے شہد مکس کرلیں، اب اس ماسک کو اپنے چہرے اور گردن پر لگائیں اور 20 منٹ تک لگا رہنے کے بعد اسے ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔

جلد کے داغ کو صاف کریں: کچے پپیتے کو اچھی طرح پیس لیں اور اسے اپنے چہرے پر آدھا گھنٹے تک لگا رہنے دیں، یہ آپ کے چہرے پر پڑنے والے داغ اور جھائیوں کو ختم کردے گا۔

پھٹی ایڑھیوں کا علاج: پپیتے کا پیسٹ بنا کر اسے اپنی پھٹی ، ایڑھیوں اور ہاتھوں پر لگائیں اس سے جلد نرم اور ملائم ہو جائے گی۔

بالوں کی گروتھ کے لیے: ایک تحقیق کے مطابق پپیتے میں موجود خاص اجزا بالوں کو طاقت دے کر انہیں گنج پن سے بچاتے ہیں۔ ایک ہفتے میں تین بار پپیتا کھانے سے بالوں کو مضبوطی ملتی ہے۔

خشکی کا علاج: ایک کچے پپیتے کے بیج نکال کر اس کا پیسٹ بنالیں اور پھر اس میں آدھا کپ دہی ملا دیں، اس آمیزے کو 30 منٹ تک بالوں میں لگائیں پھر ٹھنڈے پانی سے دھولیں، کچھ ہی دنوں میں آپ کو خشکی سے نجات مل جائے گی۔

نیچرل کنڈیشنر: پپیتا منرلز، انزائم اور وٹامنز سے بھرپور پھل ہے اس لیے یہ نیچرل کنڈیشنر کا کام کرتا ہے جس سے بال نرم اور ملائم بن جاتے ہیں۔ پپیتا، کیلا، دہی اور ناریل کے تیل کو بلینڈ کرلیں اور ایک گاڑھا پیسٹ بنالیں اور گیلے بالوں میں لگا کر آدھے گھنٹے تک بالوں کے گرد تولیہ باندھ لیں پھر ہلکے گرم پانی سے دھولیں۔

ہاتھوں اور انگلیوں کا رنگ صاف کریں

ابٹن کو تھوڑے سے پانی میں ملا کر پیسٹ بنالیں اور اس کو ہاتھوں پر لگائیں۔ جب سوکھ جائے تو رگڑ کر اتار دیں۔ اس سے ہاتھوں کا رنگ صاف ہو جائے گا۔ انگلیوں کی سیاہی دور کرنے کے لیے درج ذیل نسخے پر عمل کریں۔

دودھ ، آدھا کپ، عرق گلاب ، ایک بڑا چمچ، لیموں کا رس چند قطرے۔ یہ تینوں چیزیں ملا کر ہاتھوں پر مالش کریں۔ آدھے گھنٹے بعد دھو ڈالیں۔ چند دنوں میں آپ کے ہاتھ پیروں کی سیاہ انگلیاں سفید ہو جائیں گی۔

کالے بازو

بازوؤں کو دھوپ سے بچائیں اور لمبی آستینوں والی قمیض پہنیں اور رنگ گورا کرنے کے لیے بازوؤں پر جو کے آٹے میں دودھ ملا کر پیسٹ بنا کر لگائیں۔ خشک ہو جائے تو رگڑ کر اتار لیں۔

کالے پیر

رات کو سوتے وقت دودھ کی بالائی میں تھوڑا سا لیموں کا رس اور گلیسرین چند قطرے ملا کر اسے ہاتھوں اور پاؤں پر لگا کر کچھ دیر مالش کریں۔ ان کا رنگ نکھر جائے گا اور جلد ملائم ہو جائے گی۔

تاثرات: نگر نگر سے

مئی کے مہینے کا 'خواتین دنیا' میرے سامنے ہے۔ طباعت و اشاعت اور گیٹ اپ کے اعتبار سے ہر ماہ بہتر سے بہتر ہو رہا ہے، جس کے لیے قومی اردو کونسل کے سبھی متعلقہ اراکین مبارک باد کے حقدار ہیں۔ رو برو کے تحت نوجوان خواتین کا کامیابی اور منزل کو حاصل کرنے کے لیے ان کی محنت و لگن کے تعلق سے انٹرویو اور تحریریں خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان تحریروں سے نوجوان خواتین کی نہ صرف حوصلہ افزائی ہوگی بلکہ ان میں خود اعتمادی بھی پیدا ہوگی۔ جہاں نسواں کے تحت لکھے گئے سبھی مضامین بصیرت افروز اور چشم کشا ہیں۔ خصوصی طور سے خالد شبو، من کہ فن خاکہ نگاری کافی دلچسپ ہیں۔ یہ مضامین ریسرچ اسکالرس کی ذہنی آبیاری میں موثر ثابت ہوں گے۔ زیر نظر شمارے میں چار کہانیاں کفارہ، ان بن، پت جھڑ کی چھاں، ٹوٹ گیا اک تارا۔ ویسے تو سبھی کہانیاں دلچسپ اور عہد حاضر کے مسائل سے جڑی ہوئی ہیں لیکن کفارہ میں جس نفسیاتی کیفیت کا اظہار ہے وہ غیر معمولی ہے۔ میگزین کا شعری حصہ بھی اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں عہد حاضر کے مسائل سے جڑی ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کی نظمیں بہت متاثر کرتی ہیں۔

قانون میں خواتین اور صحت بہت معلوماتی اور عہد حاضر میں خواتین کے لیے بہت اہم ہیں۔ مختصراً رسالہ اول تا آخر بہت جاذب نظر اور معلوماتی ہے امید ہے آئندہ بھی یہ رسالہ پابندی سے جاری رہے گا۔

تبسم حیا، کریم گنج لکھنؤ

ماہنامہ خواتین دنیا کا ایک شمارہ مجھے میری ایک سہیلی نے لاکر دیا حالانکہ وہ پرانا شمارہ تھا نومبر 2017 کا لیکن اس رسالے کو پڑھنے کے بعد مجھے اس کا دوسرا شمارہ پڑھنے کا اشتیاق اس قدر بڑھ گیا کہ میں نے اس رسالے میں دیے گئے پتے پر رابطہ کیا اور اللہ کا شکر ہے کہ اس ماہ سے یعنی مئی کا شمارہ میرے پتے پر مجھے مل گیا ہے۔

میں نہ تو افسانے لکھتی ہوں نہ شاعری کرتی ہوں لیکن خواتین میں بیداری آئے، خواتین خود کفیل ہوں۔ اپنے بچوں کے ہوم ورک کو چیک کر سکیں۔ مذہب کے بنیادی ارکان سے واقف ہوں اس کے لیے ہمیشہ کوشش کرتی رہتی ہوں مجھے اس رسالے کو پڑھ کر یہ محسوس ہوا کہ آپ اگر ملک میں خواتین کو بیدار کرنے کے راستے پر چلیں تو بہت سارے اور لوگ بھی اس کام میں ہاتھ بٹانے کو مل جائیں گے۔

اس رسالے کے لیے آپ سب کو مبارک باد دیتی ہوں میں کوشش کروں گی کہ میری اور سہیلیاں بھی اس کی سالانہ خریدار بنیں۔

عنبرین بیگم، وارانسی، اتر پردیش

ماہنامہ خواتین دنیا مئی 2018 کا رسالہ ملا۔ ٹائٹل پر ہی تین کامیاب خواتین کی تصویر دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اداریہ بھی ہر مہینے کی طرح معلوماتی ہے خاص طور پر آپ نے اس بار یوم خواتین کے حوالے سے جو معلومات دی ہے وہ بے حد ضروری تھا۔ ہم کو اس سے بہت فائدہ ہوا۔ ہم لوگ یہ تو جانتے تھے کہ مئی یوم مزدور کے طور پر منایا جاتا ہے لیکن مئی کو یوم خواتین کے طور پر بھی منایا جاتا ہے اور اس کی تاریخ اتنی پرانی ہے یہ جانکاری ہمیں نہیں تھی آپ کے ذریعہ یہ معلوم ہمیں حاصل ہوئی۔ آپ اپنے اداریے میں جس طرح عورتوں کو عزت دیتے ہیں اور جس طرح ان کو آگے لانے کی کوشش کرتے ہیں یہ بہت بڑا اور اہم کام ہے لیکن اس بری حالت کے ذمہ دار صرف مرد نہیں ہیں۔ میں عورت ہو کر یہ بات کہہ سکتی ہوں کہ ہم عورتوں کو بھی اس بات کے لیے آگے بڑھنا پڑے گا ہم پر ظلم ہوتے ہیں تو اس میں کہیں نہ کہیں ہماری کوتاہی بھی ہے کیونکہ ہم اپنے اوپر ہونے والے ظلم کو سہہ لیتی ہیں اور یہ بھی بہت بڑا گناہ ہے۔ ابھی

رمضان کا مہینہ چل رہا ہے۔ ہمارے لیے یہ مہینہ عبادت کا ہے لیکن ہماری عورتیں اپنا زیادہ وقت مارکیٹنگ میں گزارتی ہیں۔ ایک تہوار کے لیے چار چار جوڑے بنواتی ہیں اور پھر اسے دوسری سہیلیوں کو دکھا دکھا کر اپنی تعریف کرواتی ہیں۔ ان کو اگر یہ معلوم ہو کہ اللہ کسی کے لباس سے کسی کو نہیں پہچانتا اور رمضان کا اصل مقصد روزہ رکھنا ہے۔ ایسا روزہ جس کو ایک مار کھنے کے بعد پھر گیارہ مہینے ہم سے کوئی برائی نہ ہو لیکن اب تو لگتا ہے رمضان کا مطلب خوب کھانا پینا، اچھے اچھے کپڑے سلوانا، مارکیٹ میں گھومنا چاہے روزہ چھوڑنا پڑے۔ یہ سب ہو گیا ہے اور یہ سب کام ہم عورتیں ہی زیادہ کرتی ہیں۔

مجھے امید تھی کہ مئی کے رسالے میں رمضان اور عید کے حوالے سے بھی کچھ ہوگا لیکن ایسا کچھ نہیں دیکھا۔ رسالہ ہر ماہ پہلے سے بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ اس بار کے رسالے میں محمد قمر تبریز کے ذریعہ سیرت فاطمہ کا انٹرویو بہت معلوماتی تھا۔ سیرت فاطمہ جیسی لڑکیوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ خواتین صرف صنف نازک نہیں ہیں اور نازک ہونے کے باوجود یہ عمل کے ہر میدان میں سرگرم ہو سکتی ہیں۔ افروز عالم ساحل نے نہایت کم لفظوں میں علمہ افروز پر مضمون قلمبند کر کے بہت سی لڑکیوں کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا ہے۔ اس کے علاوہ نور جہاں کی کہانی خالہ شبو، خورشید جہاں کی کہانی من کہ..... بھی دل کو چھوتی ہے۔ بہت بہت شکریہ!

صبا نسیم، دھول پور، تھانے، مہاراشٹر

مکرمی! خواتین دنیا کا معیار ہر شمارے میں دوچند ہوتا جا رہا ہے۔ تازہ شمارے میں کچھ تازہ کار قلمکاروں کے فن سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ مسکان ناز نے بہت خوبصورتی سے ثانیہ مرزا کے پورے کھیل کے سفر پر شاندار تبصرہ کیا ہے۔ مختصر سے مضمون میں انھوں نے ثانیہ کے مزاج اور خواہشات سمیت ان کے ماضی کا بھی جائزہ لیا ہے اور مستقبل کے ارادوں کو بھی پیش کر دیا ہے۔ نئی شاعرات میں ہی ہما شہناز کی غزل اچھی لگی ابھی شاید ان کا کلام ابتدائی مراحل میں ہے۔ اگر انھوں نے کوشش جاری رکھی تو ان کا رنگ شاعری نئے اجالے پھیلا سکتا ہے۔

'خواتین دنیا' کے اداریے تو لاجواب ہوتے ہی ہیں اس کی تزئین کاری بھی بہترین ہوتی ہے مضامین کا انتخاب اور مضامین کی زبان بہت ہی اعلیٰ و معیاری ہوتی ہے۔ خواتین دنیا میں ڈھونڈ کر نئی قلمکاروں کو لایا جائے۔ اس کی تشہیر دیگر ذرائع ابلاغ سے بھی کرائی جائے تاکہ یہ رسالہ کم از کم ہندوستان کی آدھی آبادی تک آسانی سے پہنچ سکے۔

عائزہ نسیم، عنایت کالونی، حیدر گنج، حیدرآباد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بلاشبہ اردو زبان و ادب کی ترویج وارتقا اور فروغ و اشاعت کا واحد ادارہ ہے جو بقیہ تمام سرکاری اداروں سے آگے بڑھ کر کام کر رہا ہے۔ اس نے 'بچوں کی دنیا'، 'اردو دنیا' اور اب 'خواتین دنیا' جیسے عالمی معیار کے ماہنامے جاری کر کے زبان و ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ 'خواتین دنیا' تو ایک عظیم کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔

میں نے اب تک خواتین دنیا کے صرف دو ہی شمارے دیکھے ہیں اور اس کے جاذب نظر ورق نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ جون کا شمارہ میں نے ابھی مکمل نہیں پڑھا ہے لیکن امید ہے یہ شمارہ بھی گذشتہ شمارے سے آگے ہی ہوگا۔ اس کے مشمولات قابل تعریف، حصہ مضامین سے لے کر نثر و نظم، قانونی جانکاری، کچن کی رونق وغیرہ وغیرہ بھی گوشے اپنی انفرادی شان کے حامل لگتے ہیں۔

چند مشوروں پر اپنی بات ختم کرتی ہوں اولاً یہ کہ اس میں خواتین کے لیے ایک کیریئر گائڈ شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ دوم نئے نئے کورسیز کی جانکاری بھی اگر اس میں دے دی جائے تو بہت اچھا رہے گا۔ ایک کالم صحت و تندرستی سے متعلق ایسا ہونا چاہیے جس میں خواتین اپنی بیماریوں کے بارے میں کسی ماہر لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کر سکیں یعنی خواتین اپنے امراض سے متعلق سوال کریں اور کوئی ماہر ڈاکٹر اس کا تشفی و تسلی بخش جواب دے۔ دوسرے تربیت اطفال، بچوں کو پلائے جانے والے ڈراپس اور ویکسینز کے بارے میں بھی کالم ہو۔ زچہ بچہ کی نگہداشت سے متعلق بھی اگر مواد کو جگہ دی جائے تو یہ ماہنامہ خواتین کے لیے مکمل رحمت بن جائے گا۔

صبیحہ اطہر، اورنگ آباد، مہاراشٹر

'خواتین دنیا' شاید ایسا پہلا ماہنامہ ہے جو ایک طرف خواتین کی سوچوں کے دروازے کھولتا ہے اور دوسری طرف اردو کا بین الاقوامی معیار پیش کرتا ہے۔ مجھے خواتین دنیا کے مستقل کالم بہت زیادہ پسند ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ خواتین کی لکھی کہانیاں اور مضامین بہت چاہت سے پڑھتی ہوں۔ یوں مکمل رسالہ اپنا جواب آپ ہے لیکن کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ آپ کو مشورہ دوں کہ نوجوان خواتین بالخصوص وہ طالبات جو امتحانات میں اول رہتی ہوں یا جو تمام پریشانیوں اور مصائب سے جوجھتے ہوئے حیرت انگیز طریقے سے آگے بڑھ جاتی ہیں، کے انٹرویو اور حالات زندگی پر مبنی مضامین کی اشاعت کی جائے۔ نئی شاعرات اور کہانی لکھنے والوں کی زندگی کے بارے میں بھی اگر دس بیس لائن لکھ دی جائیں تو بہت اچھا رہے گا۔

امید ہے میرے مشورے پر گو کہ لائق توجہ نہیں مگر غور کیا جائے گا۔ شکریہ

رابعہ بیگم، دلدار نگر، ضلع غازی پور، یوپی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

مغرب میں تنقید کی روایت

مصنف: عتیق اللہ
صفحات: 568
قیمت: 245/روپے

بہار کی بہار (جلد دوم)

مصنف: اعجاز علی ارشد
صفحات: 242
قیمت: 150/روپے

بہار گلشن کشمیر (جلد اول و دوم)

مرتب و مولف: پنڈت برج کشن کول
و پنڈت جگت موہن ناتھ رینہ
صفحات: 454، 537
قیمت: 275، 300/روپے

دیویندر ستیارتھی
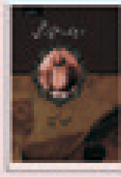
مصنف: عبدالسمیع
صفحات: 162
قیمت: 90/روپے

رشید حسن خاں

مصنف: عبدالمجید
صفحات: 122
قیمت: 74/روپے

سید امتیاز علی تاج

مصنف: محمد شاہد حسین
صفحات: 136
قیمت: 80/روپے

علی سردار جعفری

مصنف: عمر رضا
صفحات: 165
قیمت: 90/روپے

یاس یگانہ چنگیزی
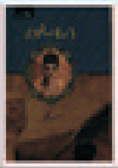
مصنف: حسن مثنیٰ
صفحات: 149
قیمت: 90/روپے

کلیات مضامین وحید اختر (جلد ششم)
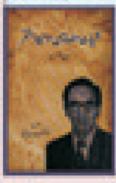
مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 216
قیمت: -/115/روپے

آئینہ جہاں، کلیات قرۃ العین حیدر (جلد پنجم، رپورتاژ)
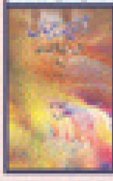
تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 407
قیمت: 182/روپے

آئینہ جہاں، کلیات قرۃ العین حیدر (جلد ہفتم، مضامین)
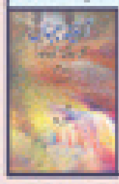
تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 359
قیمت: 165/روپے

عظیم سائنسداں (مع ترمیم و اضافہ)
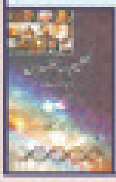
مصنف: اسرار حسین
صفحات: 121
قیمت: -/32/روپے

اسرار کشف صوفیہ 1068ھ مطابق 1658)
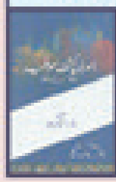
مصنف: سید محمد کمال سنبھلی واسطی
تدوین، تصحیح متن و ترجمہ
و حواشی: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی
صفحات: 803، قیمت: -/335/روپے

انتخاب سخن (جلد اول) سلسلۂ شاہ حاتم

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 388
قیمت: -/175/روپے

دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر
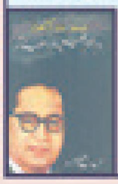
مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 155
قیمت: 70/روپے

داستان گو آیا ہے
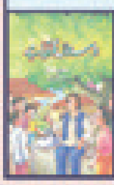
مصنف: رتن سنگھ، مصور: فجر الدین
صفحات: 16
قیمت: 25/روپے

ہماری قلم

مصنف: فراغ روہوی
مصور: فجر الدین
صفحات: 20، قیمت: 30/روپے

دوسرا آدمی

مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25/روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly June 2018, Vol. 02, Issue: 6
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ
قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

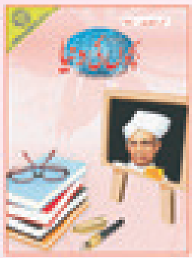

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

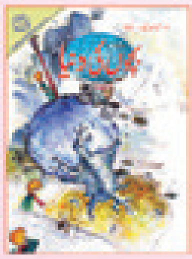
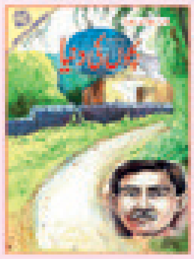

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025